جلد ۱۱۲ ستمبر ۱۹۸۹ء عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

صلی اللہ علیہ وسلم

سیرتِ سرورِ عالم

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

طویل انتظار کے بعد چھپ کر آگئی ہے۔

جلد اوّل ——— بنیادی مباحث
جلد دوم ——— حضورؐ کی ولادت سے ہجرت تک

ضخامت جلد اوّل ——— ۷۶۴ صفحات
ضخامت جلد دوم ——— ۷۶۴ صفحات

دونوں جلدیں نقشے اور تصاویر سے مزین

قیمت فی سیٹ : ۲۰۰/- روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اُردو بازار ○ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

جلد ۱۱۲	ستمبر ۱۹۸۹ء مطابق صفر المظفر ۱۴۱۰ھ	عدد ۱

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

رابطہ کے لیے: ادارہ ترجمان القرآن، رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

فون نمبر ——— ۳۲۴۴۶۸

زر سالانہ تیس روپے - فی پرچہ -/۳ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

(ن ۔ ص)

رخصت اے بزمِ جہاں!

کتنے ہی رفقا و احباب اِس دُنیا کی عارضی امتحانی زندگی سے فارغ ہو کر ابدی زندگی کے جہانِ پُراسرار میں جا چکے ہیں۔ ان مسافرانِ حیاتِ ابدی کی قطار میں مولانا نثار احمد جیسا عالم و خطیب اور مربی و مزکّی شخص بھی شامل ہو گیا۔ مولانا مرحوم ضلع ہزارہ سے تعلق رکھتے تھے، وجیہہ اور خوش گفتار اور مزاح پسند تھے۔ پاکستان میں تحریکِ اسلامی کی نمایاں خدمات امیر ضلع ہزارہ کی حیثیت سے انجام دیں۔ چند سال سے وہ برمنگھم (برطانیہ) کی جامع مسجد کی امامت و خطابت کے ساتھ ایک دینی مدرسے کے نگرانِ اعلیٰ کی ذمہ داریاں بھی ادا کر رہے تھے۔ گویا برمنگھم میں ایک اسلامی سنٹر بن گیا تھا۔ عالمِ فانی سے ان کا رخصت ہو جانا باعثِ قلق ہوا۔ خدا مولانا نثار پہ ہزار در ہزار رحمتیں نازل فرمائے۔

دوسرے مخلص ساتھی عبدالحمید خاں افسان تھے، جو سیالکوٹ کے امیر رہ چکے تھے، پھر لاہور کی جماعت میں کام کیا۔ بہت انکسار پسند اور خوش اخلاق تھے۔ ہسپتال میں زیرِ علاج تھے ۲۹ جولائی کو انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ اُن کی رُوح پر مغفرت نازل کرے۔ نیز ان کی طرح کے اور "انسان" تحریک کو عطا فرمائے۔ آمین!

سرِ خاکِ شہیدے....

محترم ملک غلام علی صاحب اور میں ۱۹۴۱ء سے چلنے والے قافلۂ حق میں اوّل روز سے شامل تھے، لہٰذا ہمارا تعلق بھائیوں جیسا رہا۔ ان کی نیکی کا ایک مظہر عزیزم انعام اللہ خاں کا دوبارہ جہادِ افغانستان میں شریک ہو کر ۱۹ اگست کو صوبۂ لغمان میں کابل کی فوج کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو جانا ہے۔ وصیت کے مطابق ان کی تدفین وہاں ہی کی گئی۔ شہید کے والدین کے سامنے اظہارِ غم سے زیادہ ہدیۂ تبریک پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کی رُوح رحمتِ حق کی کرنوں کے جھرمٹ میں ہوگی۔

سرِ خاکِ شہیدے، برگ ہائے لالہ می پاشم (اقبال)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

میں اس وقت سیاسی حالات کی آلودگیاں دیکھ کر اور اس کی انسان آزاریاں اور انصاف کی غارت گریاں دیکھ کر اس درجہ اَلم رسیدہ ہوں کہ ایک بڑی اہم بحث کو سیاست کے دائرے سے نکال کر تاریخ و اجتماعیات کے فلسفیانہ دائرے میں لے جا رہا ہوں۔ اب تو کوئی سیاسی آلائش آئے گی تو بس ایسے جیسے ایک وادیٔ پُربہار سے گزرنے والے آدمی کو کئی جگہ ندی نالے عبور کرنے پڑتے ہیں، جن میں بہت گدلا پانی آ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ٹخنوں پنڈلیوں پر کچھ مَیل کچیل رہ جائے جسے بعد میں صاف کیا جا سکتا ہے۔ مگر میری اصل بحث سیاست سے متعلق ہونے کے باوجود غیر سیاسی ہے۔

ہماری قومی ملّی اور اجتماعی زندگی کی اصل اُلجھن کیا ہے؟

میرا جواب یہ ہے ہماری ساری مصیبتیں ایک خاص مرض کی وجہ سے ہیں، جو پاکستان کے نشوونما پانے کے ساتھ ساتھ مزمن اور سخت تکلیف دہ ہوتا جا رہا ہے۔ جب تک ہم اس بیماری کی تشخیص نہ کر لیں کوئی نجات ممکن نہیں۔

ہماری ملّی زندگی کی اصل اُلجھن کیا ہے؟

اس بیماری کی وجہ سے ہمارا اب تک کا دَور، جبر و آمریت، فسطائیت، مارشل لا، اور "غیر جمہوری جمہوریتوں" کے تحت گذرا ہے، جس کی وجہ سے ہم اپنے پڑوسی مُلک کے مقابلے میں سُست رفتار اور پست مقام رہے ہیں (تجارت، صنعت، ڈپلومیسی وغیرہ پہلوؤں کے مدِنظر)، جس کی وجہ سے ہماری اخلاقی سطح مسلسل گرتی چلی آ رہی ہے اور

جرائم اور جرائم نوازی اور مجرمین کی سرپرستی کا سلسلہ روبہ ترقی ہے، جس کی وجہ سے ہم اپنی ملی وحدت کی ناقابلِ شکست قوت کو پارہ پارہ کر کے علاقائیت، نسلیت، لسانیت، فرقہ داریت اور طبقہ پرستی اور برادری نوازی، نیز اپنے اپنے چھوٹے چھوٹے سیاسی دھڑوں کی علمبرداری میں مست ہیں۔ جن کی اساس کسی معقول عقیدے، نظریے، اُصول، اخلاق اور مشن پر نہیں ہے، بلکہ محض تعصبات اور مفاد اور باہمی تصادم اور انتقام در انتقام کے چکر چلائے جا رہے ہیں، اور جس مرض کی وجہ سے ہمارے عوام مارشل لا رہو یا "جمہوری قبا" کبھی بھی اپنے حقوق، معاشی مفاد، سیاسی مساوات اور سماجی مساوات سے بہرہ مند نہیں ہوئے، جس کی وجہ سے ہم سامراجی اور اسلام دشمن اور پاکستان دشمن قوتوں کے تلووں پر بوسے دے دے کر ان سے بھیک بھی لینے کے ماہر ہو گئے ہیں اور اُن کی خوشامد کے فن میں یکتائی کے مقام پر ہیں۔ اور جس کی وجہ سے افکار، ادب، صحافت، ابلاغی وسائل، سیاسی تقاریر اور مذہبی تصورات، سبھی سے ہم اہلِ پاکستان انتشار کی قوتیں حاصل کر کے کسی مقصد کے لیے متحد نہیں ہو سکتے۔

سیدھی سی دو ٹوک بات یہ ہے کہ اوّل تو ہماری قوم مسلمان ہے، پھر اس قوم نے تحریکِ مجاہدین، تحریکِ خلافت اور آخر میں تحریکِ پاکستان کے فیضان سے اپنے دینی رجحانات کو مسلسل پرورش دی ہے۔ چنانچہ پاکستان بنتے ہی کروڑوں انسانوں میں یہ اُمید تر و تازہ ہو گئی تھی کہ بس اب اسلامی زندگی کا دَور شروع ہو رہا ہے۔ مگر لادینیت پسندوں اور جاہ پرستوں اور فرنگیت مآبوں نے اسے بار بار مایوسی کے زخم لگائے، مگر اسے کبھی قراردادِ مقاصد نے نئی زندگی دی، کبھی اسلامی دستور اور اسلامی نظام کی تحریک نے اقدام سکھایا۔ کبھی یہ علماء کے ۲۲ متفقہ دستوری اُصولوں کے نشے میں جھوم گئی، کبھی دستور کی طرف سے علماء کے اسلامی کمیشن کے مژدہ نے اسے ایمانی بہار کا پیغام دیا۔ شراب بندی نے اسے سرمست کیا، حدود کے نفاذ نے اسے روشن اسلامی مستقبل کے خواب دکھلائے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے وجود اور اس کے بھرپور کام نے اس کی مقدس آرزوؤں کو تازہ کر دیا، پارلیمنٹ

میں شریعت بل کے آنے پر یہ دم رو کے انتظار کرنے لگی کہ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے۔[1]

اب سیدھا سادا سوال یہ ہے کہ اسلام یا کچھ اور؟

کچھ اور سے مطلب یہ ہے کہ آپ سیکولرازم چاہتے ہیں؟ لبرلزم چاہتے ہیں؟ سوشلزم چاہتے ہیں؟ کھلی بے قید زندگی چاہتے ہیں؟ منکرات و فواحش سے دل بہلانا پسند کرتے ہیں؟ شراب کی ندیاں بہانا چاہتے ہیں؟

اگر آپ ایسا کچھ چاہتے ہیں تو مسلمانوں کی یہ قوم جس کے ذہنوں پر فکری اثر علامہ اقبالؒ کا ہے، سیاسی و قانونی اثر قائداعظم کا ہے اور دینی طرزِ فکر اور اسلامی نظام کی تفصیلات کے سلسلے میں بہت گہرا اور روز بروز پھیلتا ہوا، بلکہ پاکستان کے باہر کے مسلم ملکوں میں بھی اور یورپ اور امریکہ میں بھی فروغ پاتا ہوا اثر مولانا مودودیؒ کا ہے۔ (میں ان دوستوں سے معافی چاہتا ہوں جنہیں اس نام کے ذکر سے تکلیف ہوتی ہوگی)۔

اِن تین شخصیتوں کے اثرات جس قوم میں وسیع لٹریچر، تقریروں، دروس، تربیت گاہوں اور گفتگوؤں کے ذریعے ہر صبح اور شام پھیل رہے ہیں، اس میں اگر آپ اسلام سے ٹکرانے یا اُس کی نفی کرنے والی کوئی بھی فکر یا ہیئتِ کار لے کے چلیں گے تو دس کروڑ کی اس قوم میں تو بار بار خلجان، انتشار، نفرت اور تصادم کی لہریں اُٹھیں گی۔ نتیجہ یہ کہ وہ ساری خرابیاں اور بڑھیں گی جو اس وقت بھی عذابِ الٰہی کی شکل اختیار کر گئی ہیں۔ یہ اپنی قوم سے مستقل لڑائی

---

[1] راقم کو چونکہ شروع سے اس ساری کشمکش میں شریک رہنے اور حالات و رجحانات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور زندگی کا بڑا حصہ اسی معرکۂ عشق میں گذر گیا، اس لیے پورے پس منظر کو سامنے رکھ کر میں نے ترجمان القرآن کے اشارات میں ایک بار واضح تجزیہ کر کے لکھ دیا تھا کہ شریعت بل کی مخالفت و مزاحمت کے لیے جو بے شمار قوتیں کام کر رہی ہیں، وہ اس کو کبھی پاس نہ ہونے دیں گی۔

چھیڑنے کا راستہ ہے - اب یہ کھیل کہاں تک چلے گا کہ انتخاب کے وقت غیر اسلامی ذہن و کردار کے ساتھ اس قوم کے سامنے آپ اسلام اسلام پکارا کریں اور جب اقتدار مل جائے تو پھر اوّل تو اسلام کا قصہ ہی گول کریں، ورنہ سیاسی الجبرے کا یہ نیا فارمولا استعمال کریں کہ اسلام کے معنی ہیں، لادینیت، سوشلزم، مغربی جمہوریت، عُریانی و فحاشی، مخلوط ثقافتی تفریحی مجالس، عورت کی خوشی کے لیے قرآن و حدیث کے نصوص میں تبدیلی — اور اگر اس لغویت کے خلاف آوازیں اُٹھیں تو آپ کہیں کہ یہ فنڈامنٹلزم ہے اور پھر فنڈامنٹلزم کو دبانے کے لیے آپ "ڈنڈا منٹلزم" استعمال کریں۔

اِس میں شک نہیں کہ آپ اپنے ساتھ قادیانیوں کو ملالیں، عیسائیوں کو ملالیں، اسمٰعیلیوں کو ملالیں، قمیوں کو ملالیں، سندھ کے ہندوؤں کو ملالیں، ڈاکوؤں کو ملالیں اور اُوپر سے رُوس اور امریکہ اور اسرائیل اور بھارت کی سرپرستی حاصل کرلیں تو اسلام سے محبت کرنے والی قوم کو چاروں طرف سے آپ زد میں لے سکتے ہیں۔ مگر یہ انتباہ سامنے رہے کہ تاریخ میں یہ تخریبی ڈرامہ ہر مسلم معاشرے کے اسٹیج پر بے وقوف جاہ پرست بار بار کھیلتے آرہے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم کی قوتوں کو بھی تباہ کرتے ہیں اور خود بھی تباہ ہوتے ہیں — لیکن اسلام پھر اپنی نئی کونپلیں دلوں میں نکال کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ابھی روسی ترکستان (خصوصاً بخارا) میں آپ دیکھ لیں کہ لادینیت نے جبریت کے بلڈوزر بار بار پھروائے اور چار نسلیں یہ سب کچھ بے بسی سے سہتی رہیں ان کو قرآن اور مسجد سے بھی محروم کر دیا گیا۔ مگر اب چوتھی نسل (کچھ) اور پانچویں نو خیز نسل اسلام کو لے کے اُٹھ رہی ہے — ہم چو سبزہ بارہا روئیدہ ام۔

پھر کیوں نہ آپ اسلام کے خلاف اس جنگی کارروائی کو یک قلم بند کر دیں۔ لوگوں کے ایمانوں کو دیکھیں، وہ جس قرآن کو روز پڑھتے ہیں اُس کو سمجھیں، وہ جس تاریخ سے گذر کر آرہے ہیں، اُس پر نظر ڈالیں، وہ جس دورِ سعادت اور خلافتِ راشدہ کو اپنے لیے نمونہ

سمجھتے ہیں، اس کا مطالعہ کریں، وہ جن تاریخی شخصیتوں سے محبت کرتے ہیں، اُن کے کارنامے سامنے رکھیں۔ پھر عوام الناس کے دینی نمائندوں پر مشتمل کوئی مشاورتی ادارہ (اسلامی نظریاتی کونسل کی طرح کا) بنا کر اس سے پوچھیں کہ قوم کیا چاہتی ہے۔ پھر جو کچھ سامنے آئے، پورے ایمان اور زندہ ضمیری کے ساتھ اُسے نافذ کر دیں۔

اِس راستے پر دس سال کے لیے چل کر دیکھیے کہ کیا نتائج نکلتے ہیں۔

جرائم پر آپ کو کیسے قابو حاصل ہوتا ہے۔ تفریق پیدا کرنے والے تعصبات کتنی آسانی سے ختم ہوتے ہیں، معاشی ترقی کی رفتار کتنی بڑھتی ہے۔ خیانت و رشوت کا سلسلہ کس تیزی سے ختم ہوتا ہے۔ آپ کی فوج اور اسلحہ ساز ادارے کس نئی روح سے مالا مال ہوتے ہیں۔ آپ کو عالمِ اسلام میں کیا نیا مقام حاصل ہوتا ہے، ملحدانہ تہذیب اور سامراجیوں کی غلامی اور مغرب کی تقلید اور یہود و ہنود کی عیاریوں سے نکل کر آپ کہاں سے کہاں پہنچتے ہیں۔

نہیں منظور تو پھر تیسری بات سنیے۔

تیسری ضروری بات یہ ہے اور اس پر بہت غور کرنا چاہیے کہ سوال جمہوریت کے ہونے نہ ہونے کا نہیں ہے اور ہے تو اس معنی میں ہے کہ ملک کی بھاری اکثریت کے رجحانات کے مطابق حکومت چلائی جائے، ان کے مسائل معلوم اور حل کیے جائیں۔ بصورتِ دیگر حکومت اور عوام کے درمیان ایک خلا پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اُدھر کا کنارہ اِدھر، اور اِدھر کا کنارہ اُدھر! نہ وہ آگے بڑھتا ہے، نہ یہ پیچھے ہٹتا ہے، بلکہ روز بروز دُور تر ہوتے جاتے ہیں۔ درمیانی خلا بڑھتا جاتا ہے۔

یاد رکھیے "خلا محال ہے قدرت کے کارخانے میں" ___ آپ اسلام کو یہ خلا بھرنے نہیں دیتے، کوئی اور صورت نہیں ہے۔ لازماً کوئی نہ کوئی قوت اس خلا کو بھرتی ہے ___ یہ تاریخ کا اٹل قانون ہے۔

اِس خلا کو دو طرح کی قوتیں بھر سکتی ہیں :
۱۔ کوئی بیرونی قوت (اور اس وقت کئی بیرونی قوتیں کمین گاہوں میں بیٹھی میزائیلوں کو نشانوں پر فِٹ کیے ہوئے ہیں)۔
۲۔ اندرونی قوت (جسے آپ مارشل لا کہتے ہیں)۔

مارشل لا کو گالیاں دیں، اس کے خلاف نفرت پھیلائیں، اسے زنجیروں میں باندھ دیں۔ مگر آپ کسی بیرونی قوت کو کیسے باندھ کے رکھیں گے۔

میں ہرگز نہیں چاہتا اور ہرگز نہیں کہتا کہ مارشل لا کی بات دماغ سے قریب تک ہو کے گذرے۔ تباہ ہونا منظور ہے، مگر مارشل لا منظور نہیں۔

سوال صرف یہ ہے کہ پھر وہ خلا کیا نتیجہ پیدا کرے گا جو آپ کی حکیمانہ پالیسیوں کی وجہ سے روز بروز وسیع ہو رہا ہے۔

کوئی تیسری قوت آپ تجویز فرمائیں!

---

(۲)

ستمبر پھر آگیا۔ یہ ہماری تاریخ کا ایک اہم مہینہ ہے، خصوصاً اس کے ۱۷ دن ۔ جہاد کے دن[۱]!

بھارتی جارحیت پسندوں سے ہمارا سپاہی جس جذبۂ ایمانی، ذوقِ جہاد اور شوقِ شہادت کے ساتھ لڑا ۔ ان کی برکت سے ہماری مِلّی تاریخ کے نہایت درخشاں ابواب فضاؤں میں قدرت نے سنہری حروف میں لکھے اور ان کی جھلملاہٹ پوری دنیا میں پاکستان کی اور ہماری چکاچوند پیدا کر رہی ہے۔

---

[۱] ماہِ ستمبر اس لحاظ سے بھی "ستم بر" اور ستم گر بن کے آتا ہے کہ ہم سے مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ اور آپا حمیدہ بیگم کی جدائی بھی اِسی ماہ میں ہوئی تھی۔ یہ ہستیاں بھی تا دمِ آخر خدائی مشن کی راہ میں کام کرتے ہوئے جب ختم ہوئیں تو یقیناً انہیں بھی شہادت ہی کے مقام پر سرفراز کیا گیا ہوگا۔

زخمیوں کی قطاریں، شہیدوں کی خون میں ڈوبی میتیں لیے مسرت و تفاخر کے عَلَم فاتحانہ شان سے لہراتی نگاہوں کے سامنے سے گذر رہی ہیں۔ ہمارے سارے اسلحہ، ہمارے سارے سامانوں، ہمارے دولت کے انباروں اور ہمارے عہدوں کی کرسیوں سے شہدا کا مرتبہ بلند ہے۔ اور فدائیانِ اسلام اور محبانِ پاکستان میں سے شہدا کی جو صفِ جاودانی آگے نکلی ہے وہ ہمارے لیے سرمایۂ فخر ہے۔

لوگوں کو چاہے اختلاف ہو، راقم کی نگاہ میں ذاتی شرافت کے لحاظ سے اسلامی زندگی رکھنے والا، اسلام کے بعض اُصولوں، روایتوں اور اداروں کو زندہ کرنے والا، جہادِ افغانستان کے جنرل عبدالرحمٰن کے آگے آگے رہ کر نہایت بدطینت طاقتوں کی اسلام دشمن ڈپلومیسی کے خلاف جنگِ مسلسل لڑنے والا، حرمین کی نورانی فضاؤں سے دل کی روشنی حاصل کرنے والا اور ۱۷ اگست کو دفاعِ پاکستان کی خاطر جدید بھاری اسلحۂ جہاد کے معائنے کے سفر میں جان جانِ آفریں کو سپرد کرنے والا جنرل محمد ضیاء الحق نہایت بدیہی طور پر شہید ہے (جو نہ ماننا چاہے، نہ مانے، یہ کوئی زبردستی کا معاملہ نہیں)۔

شہید جنرل کے قافلۂ فضائی کے تمام مُسلم شرکا بھی سفرِ شہادت میں اُن کے ہم سفر ہیں۔ مجھے خاص طور پر سازش کے نشانۂ اولین مشہود پائلٹ کا بڑا خیال آتا ہے۔

ان تمام شہیدوں کی یاد کو سرمایۂ عزم بنا کر ہم اپنے فوجی غازیوں کے ماٹو "ایمان، تقویٰ، جہاد" کی روشنی میں یقین رکھتے ہیں کہ وہ بہ توفیقِ ایزدی پاکستان کو بدطینت اور سیاہ رُو عفریتی طاقتوں کے منصوبہ ہائے بَد سے محفوظ رکھنے کا حق ادا کر دیں۔ ہم سب آج بھی ان کے ساتھ ہیں اور کل کوئی اور آزمائش آئی (خدا نہ کرے) تو اسلام کے لیے وقف شدہ سرزمین کے ہر ذرّے کی حفاظت کے لیے جان، مال، نقدی، خون اور دعاؤں سے ان کے پہلو بہ پہلو ہوں گے۔

صِبغۃ اللہ

جناب حافظ محمد ادریس صاحب

(۲)

تاریخ میں ایسے بے شمار نمونے میرے سامنے ہیں جہاں پورے خاندان پر صبغۃ اللہ غالب نظر آتا ہے۔ پورا گھرانہ بقعۂ نور اور گھرانے کا ہر فرد روشنی کا مینار بن کر نمودار ہوتا ہے۔ یہاں میں ایک مثال دورِ صحابہؓ سے پیش کرنا چاہتا ہوں، جو صبغۃ اللہ کی اعلیٰ جھلک دکھاتی ہے ___ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آپؐ کے جان نثار بڑے ذوق وشوق سے آتے تھے اور نہایت ادب و احترام سے بیٹھتے تھے۔ ہر بات کو غور و توجہ سے سُنتے اور دل میں بٹھا لیتے تھے۔ کوئی اشکال پیش آتا تو سوال پوچھتے اور وضاحت ہو جاتی تو بیٹھے سر دُھنتے کے بجائے سراپا عمل بن جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مجلسِ نبویؐ میں حضور اکرمؐ کی زبان مبارک سے ایک آیت کریمہ سُنی گئی۔ وہ آیت جو ہم روزانہ پڑھتے ہیں اور پڑھ کر گذر جاتے ہیں۔ حضورؐ نے آیت پڑھی:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا ۔ (الحدید۔ آیت ۱۱)

کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے تاکہ اللہ اُسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے۔

مجلس میں حضورؐ کے قریب بیٹھے ہوئے ایک نوجوان صحابی نے آیت سُن کر ایک سوال پوچھا "یارسول اللہ! کیا اللہ ہم سے قرض مانگتا ہے؟" سوال بڑا معصومانہ مگر موقع محل کے عین مطابق تھا۔ آخر اللہ کو قرض مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ غنی ہے اور اس کے خزانوں میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ وہ بے بس و بے کس بندوں سے قرض کیوں کر مانگتا ہے؟ اِس سوال

کے جواب میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''ہاں ! اے ابوالدحداحؓ، یہ ابو دحداحؓ مدینہ کے انصاری صحابیؓ تھے۔ کھیتی باڑی اور باغبانی ذریعہ معاش تھا۔ نوجوان تھے اور نوجوانی میں عموماً لوگ معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی فکر میں مشغول رہتے ہیں۔ مگر یہ نوجوان تو صبغۃ اللہ میں رنگا ہوا تھا۔ وہ اللہ کی رضا کا طلب گار اور جنت کا خریدار تھا۔ نوجوان ابو دحداحؓ نے عرض کیا ''یارسول اللہ! اپنا دستِ مبارک تو بڑھایئے۔ جب آپؐ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو انھوں نے دستِ رسالت مآب میں اپنا ہاتھ دے کر کہا ''میرے آقا! آپ گواہ رہیں کہ میں نے اپنا باغ اللہ کو قرض دے دیا ہے''۔

یہ باغ کوئی معمولی باغ نہ تھا۔ اِس میں کھجور کے پھل دینے والے چھ سو درخت تھے۔ ٹھنڈے میٹھے پانی کا کنواں تھا۔ باغ کے گرد فصیل بنی ہوئی تھی اور اسی باغ کے اندر ان کا چھوٹا سا مکان تھا، جہاں ان کی بیوی اور ان کا بچہ دحداح تھا۔ یہ نوجوان اپنی بھرپور جوانی کے ساتھ صبغۃ اللہ میں رنگا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اللہ کے ساتھ ایمان کی صورت میں اس نے ایک سودا کر رکھا ہے۔ جان اور مال اُس نے بیچ دیئے ہیں اور بدلے میں اُس کے مالک نے اس سے جنت کا وعدہ کیا ہے۔ اس خوش قسمت نوجوان کے بڑے بلند نصیب تھے کہ صبغۃ اللہ اس کی ذات تک محدود نہ تھا، بلکہ اس کے پورے گھرانے کو اُس نے مالا مال کر رکھا تھا۔ ایمان کی بلندیوں سے کوئی مومن ایسا انقلابی اور قابلِ داد فیصلہ کر سکتا ہے، مگر اس پر عمل کرنے میں دِقتیں پیش آنے لگتی ہیں۔ بیوی بچے پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں۔ عزیز و اقارب راستے کا روڑا بن جاتے ہیں۔ اس کے باوجود بندۂ مومن وہ کچھ کر گزرتا ہے جس کا اُس نے عہد کیا ہوتا ہے، مگر یہ وہی شخص جانتا ہے کہ کس قدر مشکل سے یہ مرحلہ اُسے سر کرنا پڑتا ہے۔ پھر کبھی کبھار تو قدم ڈگمگا بھی جاتے ہیں اور حالات انسان کو مجبور کر ڈالتے ہیں۔ انسان اس بات پر کڑھتا رہتا ہے کہ اُسے جن لوگوں کا راعی بنایا گیا ہے وہ کیوں اس رنگ کو نہیں اپناتے جو سب سے پیارا، سب سے اچھا، سب سے زیادہ نفع بخش اور خالص رنگ ہے۔

اب آیئے ذرا ایک نظر اس خوش قسمت گھرانے کے افراد کو دیکھ لیں جو سب صبغۃ اللہ

سے سرشار تھے۔ ابو دحداح حضور اکرمؐ کی مجلس سے جو عہد کر کے اُٹھے تھے، اب اس کی اطلاع اپنی اہلیہ کو دینے کے لیے اپنے باغ کی طرف چلے۔ آیئے ہم بھی تھوڑی دیر کے لیے اس باغ کے دروازے پر پہنچ جائیں اور وہ ایمان پرور مکالمہ سُن لیں جو تاریخ کے سینے میں آج بھی جگمگ کر رہا ہے۔ ابو دحداح اب دروازے پر آ پہنچے ہیں۔ دروازے پر ان کے قدم رُک گئے ہیں۔ وہیں کھڑے کھڑے آواز دیتے ہیں۔

"اے دحداح کی ماں"، اُدھر سے جواب آتا ہے "لبیک یا ابا دحداح" فرماتے ہیں "اپنے بچے کو اُٹھا لو اور اس باغ میں سے نکل آؤ۔ میں نے یہ باغ اللہ کو قرض دے دیا ہے۔" اپنے بچے کو اُٹھا رہی ہیں اور وہیں سے کہہ رہی ہیں "دحداح کے ابو تمہیں مبارک ہو، خدا کی قسم! تم نے جو سودا کیا ہے، اس میں کوئی خسارہ نہیں ہے۔" (ابن کثیر سورہ الحدید بحوالہ ابن ابی حاتم بروایت ابن مسعود)

سُبحان اللہ! کیا شان ہے صبغۃ اللہ کی! مال کی قربانی کی باتیں تو بہت لوگ کرتے ہیں۔ اِس بارے میں آیاتِ قرآنی اور احادیثِ مقدسہ کا مطالعہ بھی بہت کیا جاتا ہے، مگر صبغۃ اللہ کا امتحان تو مطالعے اور حوالہ جات کا مرہون نہیں ہوتا۔ یہ امتحان تو اُس وقت ہوتا ہے جب اللہ کی طلب پر مال پیش کر دیا جائے۔ اور اس سودے کو خسارے کا سودا نہ سمجھا جائے۔ امتحان کی گھڑی میں پتہ چل جاتا ہے کہ اصلی رنگ کس نے اپنایا ہے اور نقلی رنگ کس کے حصے میں آیا ہے۔

ہمارے پاس یہ کسوٹیاں ہیں جو کھرا اور کھوٹا بالکل واضح کر دیتی ہیں۔ ہمیں ان کسوٹیوں پر اپنے آپ کو پرکھ کر اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔

دُنیا میں بڑے بڑے بھڑکیلے رنگ نظر آتے ہیں۔ یہ اہلِ دُنیا کو خیرہ کر دیتے ہیں۔ لوگ انہیں دیکھ کر پکار اُٹھتے ہیں کہ صاحبِ رنگ بڑا خوش نصیب ہے۔ یہ ہوس پرستوں کی کوتاہ بینی ہوتی ہے۔ درحقیقت نہ وہ خوش نصیب ہے، نہ اُس کا رنگ کسی کام کا۔ یہ سب جھوٹ اور تصنع ہوتا ہے۔ آج موجود ہے، کل عنقا! فرعونی رنگ، قارونی رنگ، جاہلی رنگ، مادہ پرستانہ رنگ، غرض جھوٹے رنگوں کی یہ سب ریزہ کاری اور سحر انگیزی محض سراب اور دھوکہ

ہے۔ ان جھوٹے رنگوں میں رنگے جانے والے بھی اپنے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور انہیں دیکھنے والے بھی۔ ان رنگوں کی ترجمانی قرآن مجید کے الفاظ میں یوں کی گئی ہے۔

"ایک روز فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا۔" لوگو، کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے۔ اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں، کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا؟ میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو بے وقعت و حقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کرسکتا؟ کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اُتارے گئے؟ یا فرشتوں کا ایک دستہ اُس کی اردلی میں نہ آیا؟" اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی، درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ۔ آخر کار جب انہوں نے ہمیں غضبناک کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔ اور ان کو اکٹھا غرق کر دیا اور بعد والوں کے لیے پیش رو اور نمونۂ عبرت بنا کر رکھ دیا۔"

(سورہ زخرف۔ آیات ۵۱ تا ۵۶)

یہ تو شہنشاہیت کے رنگ میں رنگے ہوئے ایک فسوں زدہ حکمران کی خودستائی و نمود کا نمونہ ہے۔ ایک اور نمونہ دیکھیے، جسے دیکھنے والوں نے اپنی کم عقلی کی وجہ سے قابلِ رشک گردانا۔

"ایک روز وہ (قارون) اپنی قوم کے سامنے پورے ٹھاٹھ میں نکلا۔ جو لوگ حیاتِ دُنیا کے طالب تھے وہ اُسے دیکھ کر کہنے لگے۔" کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے۔ یہ تو بڑے نصیبے والا ہے"۔ مگر جو لوگ علم رکھنے والے تھے وہ کہنے لگے۔" افسوس تمہارے حال پر، اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لیے جو ایمان لایا اور نیک عمل کیے اور یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو۔"

آخر کار ہم نے اُسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔ پھر کوئی اس کے حامیوں کا گروہ نہ تھا۔ جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کو آتا۔ اور نہ وہ خود اپنی مدد آپ کرسکا۔ اب وہی لوگ جو کل اُس کی منزلت کی تمنا کر رہے تھے

کہنے لگے " افسوس ہم بھول گئے تھے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا دیتا ہے۔ اگر اللہ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا "
(سورہ القصص - آیات ۷۹ تا ۸۲)

یہ جھوٹے مگر شوخ رنگ ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ آج بھی فرعونی رنگ اور قارونی رنگ دُنیا میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ دُنیا تو رنگوں کی آماج گاہ ہے۔ سرمایہ داری کا رنگ، عسکری قوت کا رنگ، شہزادگی کا رنگ اور نہ جانے کون کون سے رنگ! آپس میں یہ سب رنگ مختلف بھی ہوں تو ان رنگوں میں رنگے ہوئے عناصر کی فکر اور ذہنیت ایک جیسی ہوتی ہے۔ اور ان کا انجام بھی کم و بیش یکساں ہی ہوتا ہے۔ انجام کو دیکھ کر یہ رنگ کافور ہو جاتا ہے اور رشک کرنے والے یہ حالت دیکھ کر سر پیٹ لیتے ہیں کہ وہ کس دھوکے کا شکار ہو گئے تھے یہ رنگ رنگیلے، شوخ بھڑکیلے لوگ تاریخ کی گیلریوں میں جگہ جگہ نشانِ عبرت بنے بے بسی اور حماقت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ جس طرح یہ عناصر ماضی میں اپنے انجام کو پہنچے تھے آج بھی اس سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔

صبغۃ اللہ کے کمالات بے شمار اور اس کی عظمت بے حد و بے انتہا ہوتی ہے۔ یہ رنگ تختِ شاہی پر بھی ہر دوسرے رنگ کی آمیزش سے پاک رہتا ہے اور تختۂ دار پر بھی کبھی پھیکا نہیں پڑتا۔ اسے تاریخ نے بارہا آزمایا۔ تلوار کی تیز دھار پر اس کا امتحان لیا۔ اقتدار کے ایوانوں میں لے جا کر اسے آزمایا، خوشی کے لمحات میں اسے پرکھا اور غم کی گھڑیوں میں اُسے جانچا، رضا کی انتہائی گہرائیوں میں اُسے ناپا اور غصّے کی بلند ترین چوٹی پر اسے تولا۔ ہر مرتبہ اُسے اصلی اور کھرا پایا۔

ایک مثال تاریخ کے صفحات سے اور دیکھ لی جائے۔ صبغۃ اللہ کس طرح انسان کی کایا پلٹ دیتا ہے۔ ایک شہزادہ نیک دل و نیک نہاد، پاکیزہ صفت، پاک باز، مگر رنگ بہرحال شہزادگی کا اپنائے ہوئے تھا۔ ایک پاکیزہ ترین خطّے کا گورنر بنا دیا گیا۔ اس شہزادے میں عام شہزادوں جیسا کوئی عیب تو نہ تھا، مگر اس نے رنگِ شہزادگی سے

دست کش ہونے کا ابھی فیصلہ نہ کیا تھا۔ وہ اپنے غلام کو حکم دیتا ہے کہ اس کے لیے بازار سے ایک جوڑا کپڑوں کا خرید لائے۔

غلام شہزادے کی نفاست و جمال پسندی سے واقف تھا۔ شہر کا ہر بازار اور بازار کی ہر دکان اُس نے چھان ماری۔ بالآخر ایک پارچہ اُس نے پسند کیا اور ایک جوڑا ۱۲۰۰ درہم میں خرید لیا۔ اس سے زیادہ قیمتی، ملائم اور اچھا کپڑا اس شہر میں کسی کے پاس نہ تھا۔ کپڑا شہزادے کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ خوش ذوق شہزادے نے ایک نظر کپڑے کو دیکھا، پھر ہاتھ سے اُسے ٹٹولا اور کہا ـــ "کتنا کھُردرا کپڑا لائے ہو؟ اس سے بہتر کپڑا بازار میں نہیں تھا؟"

وقت گذرتا رہا۔ آخر ایک دن اُس شہزادے کو تخت و تاج سنبھالنے کا مژدہ سُنایا گیا۔ اُس وقت تک اُس کا رنگِ شہزادگی اُتر چکا تھا۔ اب وہ صبغۃ اللہ کے رنگ میں رنگ چکا تھا۔ اُس نے بظاہر یہ خوش آئند خبر سُنی تو سکتے میں آگیا۔ اُس نے آنکھیں جھکا لیں۔ پھر سر اوپر اُٹھایا اور فکر میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا ـــ "لوگو! مجھ پر خلافت کا بار میری مرضی کے بغیر ڈال دیا گیا ہے اور عام مسلمانوں سے بھی مشورہ نہیں لیا گیا۔ میری بیعت کا جو قلادہ تمہاری گردن میں ہے اُس کو میں خود نکال لیتا ہوں۔ تم جسے چاہو اپنا خلیفہ مقرر کر لو۔" مگر تمام لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ وہ آپ کی خلافت پر راضی ہیں۔

اُس نے صبغۃ اللہ کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ ملوکیت سر پیٹ کر رہ گئی۔ وہ اپنا رنگ روپ کھو بیٹھی، تلملاتی رہی اور غراتی رہی، مگر صبغۃ اللہ میں رنگے ہوئے اس عظیم انسان نے اُس کی ایک نہ سُنی۔ اُس نے خلافتِ راشدہ کی تجدید کی اور پہلی صدی کا مجدد کہلایا۔ تاریخ اُسے آج بھی ادب سے جھک کر سلام کرتی ہے۔ وہ اسلامی تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہے اسے لوگ اسلام کے خلیفۂ راشد عمر بن عبدالعزیز کے نام سے جانتے ہیں۔ اُس کی نظروں میں شہزادگی و شہنشاہیت کے رنگ بے وقعت و بے حیثیت بن کر رہ گئے تھے۔ اُس نے خوب سمجھ سوچ کر صبغۃ اللہ کا رنگ اپنایا تھا۔

آج پھر اُس نے اپنے غلام کو بُلایا۔ اُس کے جسم کا لباس بوسیدہ ہو چکا تھا۔ اُسے ایک نئے جوڑے کی ضرورت تھی۔ غلام سے کہا کہ کپڑا خرید لائے۔ غلام بازار میں گیا۔ پہلے ہی پارچہ فروش کے پاس اُس نے ایک کپڑا دیکھا، اُسے پسند آگیا اور دو درہم فی گز کپڑا خرید لیا۔ غلام نے کپڑا آقا کی خدمت میں پیش کیا۔ آقا نے کپڑے کو ہاتھ میں لیا اور خوشی سے کہا "بڑا نفیس اور نہایت ملائم کپڑا ہے"۔

تختِ شاہی پر صبغۃ اللہ عجیب رنگ اور بہار دکھاتا ہے۔ صبغۃ اللہ میں رنگا ہوا یہ حکمران ایک رات نماز کے بعد اپنے گھر آتا ہے۔ اپنی بچیوں کے کمرے میں جاکر ان کا حال احوال پوچھتا ہے۔ اُسے اپنی بچیوں سے بے پناہ پیار ہے۔ اور اس کی بچیاں بھی اس سے بے تحاشا محبت کرتی ہیں۔ بچیاں اپنے باپ کے سوالوں کا جواب دیتے وقت منہ پر اپنے دوپٹے کا پلو ڈالے ہوئے ہیں۔ باپ نے وجہ پوچھی تو بچیوں نے کہا۔ "ابا جان! آج گھر میں روکھی روٹی اور پیاز کے سوا کھانے کو کچھ نہ تھا۔ ہم نے پیاز کے ساتھ روٹی کھائی ہے جس کی وجہ سے منہ سے بُو آرہی ہے۔ اس لیے ہم نے منہ کو ڈھانپ رکھا ہے"۔ باپ کا دل بھر آیا۔ اپنی بچیوں کو سینے سے لگا لیا۔ باپ بھی رویا اور بیٹیاں بھی سسکیاں لینے لگیں۔ پھر باپ نے کہا "میری بچیو! اگر تمہارا باپ چاہتا تو ساری دُنیا کی دولت تمہارے قدموں میں لا کر ڈھیر کر دیتا مگر اس صورت میں تم اور تمہارا باپ دوزخ کا ایندھن بن جاتے۔ تمہارے باپ نے فیصلہ کیا کہ دُنیا کی عارضی زندگی روکھی سوکھی کھا کر گزار لی جائے اور دوزخ کی آگ سے اپنے آپ کو بچا لیا جائے"۔

اب نہ بچیوں کو کوئی شکوہ تھا نہ باپ کو کوئی غم۔ ہمیں بھی سوچنا چاہیے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے دعویٰ تو صبغۃ اللہ کا کر رکھا ہے اور رنگ کوئی دوسرا اپنا رکھا ہے۔ جماعتِ اسلامی کی دعوت سوائے اس کے کچھ نہیں کہ صبغۃ اللہ کو زندگی کے ہر میدان میں اپنا لیا جائے۔ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی، معاشرت ہو یا معیشت، تعلیم ہو یا تجارت، سیاست ہو یا عدالت، شادی ہو یا غم ہر حال میں صبغۃ اللہ کا اہتمام۔ یہی جماعت کی دعوت ہے۔ اور یہی اس کا نصب العین۔ ہمارے اہل و عیال پر اس رنگ کا کتنا اثر ہے ہم میں سے

ہر ایک کو سوچنا چاہیے۔ ہم خود اس رنگ میں رنگ جائیں گے تبھی تو ہمارے گھر والوں پر بھی اس کا اثر ہوگا۔ ہمیں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنے دل سے پوچھنا چاہیے کہ اگر ہماری روزی تنگ کر دی جائے تو کیا ہمارے بیوی بچے حلال کی روکھی سوکھی کھانے پر قانع ہو جائیں گے؟ اگر کبھی اللہ کی راہ میں قرضِ حسنہ دینے کا مرحلہ آجائے تو ہم اس میں سرخرو ہو سکیں گے؟ اگر کبھی ابتلا و امتحان کی منزل آ پہنچے تو ہمارا صبغۃ اللہ کا رنگ قائم رہ جائے گا؟

دورِ قدیم کی مثالیں میں نے آپ کے سامنے پیش کیں۔ میں نے آنکھوں کو اشک بار ہوتے دیکھا۔ خدا کرے کہ یہ باتیں دل میں اُتر کر دیرپا اور اثر انگیز ثابت ہو سکیں۔ میں اپنی گذارشات کو دورِ جدید کی چند مثالوں پر ختم کرتا ہوں۔

صبغۃ اللہ میں رنگے ہوئے سید حسن البنا شہید کا جنازہ اُٹھا تو اُس کا منفرد انداز تھا۔ تاریخِ انسانی کا یہ جنازہ اپنی نوعیت کا میرے علم کی حد تک واحد جنازہ ہے۔ شہید کے جنازے میں لوگوں کو شامل ہونے سے روک دیا گیا تھا۔ افرادِ خانہ نے جنازے کو کندھا دیا تو منظر بڑا دردناک تھا۔ گھر میں مرد نہیں تھے تو عورتوں کو جنازہ اُٹھانا پڑا۔ بوڑھا نابینا باپ جس کی عمر نوّے سال کے قریب ہے، اپنے جوان سال شہید بیٹے کے جنازے کو کندھا دیتا ہے۔ شہید کی بیوہ، بہن اور بیٹی نے دیگر پائے اُٹھا رکھے ہیں۔

آج صبغۃ اللہ کا امتحان ہے اور واقعۃً سخت ترین امتحان ہے۔ شہید کی ۱۸ سالہ بیٹی صبغۃ اللہ کی جھلک پیش کرتی ہے۔ اگر وہ اپنے عظیم باپ کی طرح صبغۃ اللہ میں رنگی ہوئی نہ ہوتی تو بے ہوش ہو کر گر پڑتی۔ اس نے بلند آواز سے اپنے باپ کو مخاطب کر کے اہلِ دنیا کو پیغام دیا۔ "ابا جان! آپ کے جنازے کے ساتھ لوگوں کا ہجوم نہیں۔ زمین والوں کو روک دیا گیا ہے، مگر آسمان والوں کو کون روک سکتا ہے؟ میں دیکھ رہی ہوں کہ شہداء کی روحوں کا قافلہ آپ کے جنازے کے ساتھ چل رہا ہے......میں آپ سے عہد کرتی ہوں کہ پرچمِ حق کو کبھی سرنگوں نہ ہونے دوں گی۔"

صبغۃ اللہ میں رنگی ہوئی یہ بچی امتحان گاہ میں کامیاب ہو گئی ہے۔ رنگ نہ پھیکا پڑا

ہے، نہ بدلا ہے۔

اور وہ منظر تو آپ میں سے کئی لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ میں نے بھی اسے دیکھا تھا اور وہ منظر آج بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔ سیّد مودودیؒ، میرے اور آپ کے مُرشد خطاب کے لیے سٹیج پر کھڑے ہیں۔ چند فقرے ہی بول پائے ہیں کہ تڑ تڑ گولیاں چلنے کی آواز آتی ہے، دیکھتے ہی دیکھتے ایک قیمتی انسان خاک و خون میں لوٹ جاتا ہے۔ گولیوں کا رُخ صبغۃ اللہ میں رنگے ہوئے امیر جماعت کی طرف ہے۔ کہنے والوں نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا "مولانا بیٹھ جایئے" مگر مولانا نے اطمینان اور سکون سے جواب دیا "اگر میں بیٹھ گیا تو پھر کھڑا کون رہے گا"

صبغۃ اللہ کا آج پھر امتحان لیا گیا ہے۔ ہزاروں انسانوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، دوست اور دشمن سب پکار اٹھے کہ یہ رنگ اصلی رنگ ہے۔

میرے بھائیو اور بہنو! مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔ ایمان افروز مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ تاریخ کے لامتناہی سلسلے میں سے چند پھول چن کر میں نے ایک گلدستہ آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ آیئے اس بات کا عہد کریں کہ اس گلدستے کو دیکھتے ہوئے اپنا جائزہ لیتے رہیں گے۔ اور صبغۃ اللہ کے ابدی رنگ میں اپنے آپ کو رنگنے کی سنجیدہ کوشش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

اِسلام میں عورت کی شہادت

محترمہ اُمِّ حسن صاحبہ۔ منصورہ، لاہور

(۲)

اصل بحث اب آیئے اصل بحث کی طرف یعنی عورت کی نصف شہادت کے بارے میں قرآنِ پاک میں سورۂ بقرہ میں قرض کے لین دین اور مالی معاملات کے دوران ارشاد ہوتا ہے:

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى - (آیت - ۲۸۲)

ترجمہ: اور اپنے مردوں میں سے دو کو گواہ بنا لیا کرو۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔ گواہ وہ ہوں جنہیں تم پسند کرتے ہو تاکہ اگر ایک ان میں سے بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے"۔

یاد رہے کہ ہندو مت ہو یا بدھ مت، بلکہ یہودیت، کسی میں عورت کی گواہی سرے سے تسلیم ہی نہیں۔ یہ اِسلام ہی ہے جس نے عورت کو شہادت کا حق دیا ہے، مگر ساتھ ہی اپنے علمِ کامل اور تحقیق کی بنا پر عورت کی گواہی کو مرد کے مقابلے میں نصف تسلیم کیا ہے اور شہادت کا یہی نصاب انجیل میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ (یوحنا - باب ۸ - ص ۱۷)

جب کہ دورِ جدید کے تفسیر بالرائے سے کام لینے والے متجددین آیت کی تفسیر یوں کرتے ہیں:

"گواہی تو ایک عورت دے گی، لہٰذا شاہدہ (گواہی دینے والی) وہی ہے،

جب کہ دوسری مذکرہ (یاد دلانے والی) ہے۔ جو شہادت کے کسی حصہ کو بھولنے پر اطلاع دے گی[1]

لہٰذا ثابت ہوا کہ:

"اسلام میں ایک عورت کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے۔"

جب کہ قرآنِ پاک مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ کے الفاظ لاکر دونوں عورتوں کو مع مرد کے شاہد قرار دے رہا ہے۔ دوسری صورت میں وہ ایک مرد اور ایک عورت کو تو شاہد کہتا ہے اور دوسری عورت کو مذکرہ مگر اُس نے سب کو شُهَدَآءِ کہا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں عورتوں کی حیثیت شاہد ہی کی ہے اور وہ دونوں بیک وقت گواہی دیں۔ تب اُن کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہوگی۔ ویسے بھی مندرجہ بالا تفسیر پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ (آپ کے بقول) ایک عورت کی یادداشت قوی ہونے کی صورت میں دو کے بجائے اگر ایک ہی عورت کی گواہی قبول ہو سکتی ہے تو پھر ہمیں بھی یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ اگر دو عورتوں کی یادداشت کمزور ہے تو پھر دو کے بعد تیسری اور تیسری کے بعد چوتھی عورت کو بھی ایک مرد کے بجائے گواہی دینے کے لیے لایا جا سکتا ہے نعوذ باللہ

اصل بات یہی ہے کہ اگرچہ عورت کی یادداشت قوی ہو تب بھی اللہ کا حکم یہی ہے کہ ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کی گواہی ہی سے مکمل نصاب بنتا ہے

چند تفسیری حوالے اس آیت (۲۸۲ - بقرہ) کی تفسیر میں چند مشہور تفسیروں سے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

۱- امام ابن جریر طبری لکھتے ہیں: اکیلی عورت کی گواہی غیر مقبول ہے۔ جب دو عورتیں ہوں گی تب ایک گواہی بنے گی۔ اس طرح دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہوگی۔ جلد ۳ - ص ۸۲

---

[1] یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی موقع پر "ب" "ت" کو یاد دلائے اور پھر کسی جگہ "ب" بھولے تو "ت" یاد دلائے۔ یہ لین دین تو جاری رہے گا۔ (ف۔ ص)

۲- امام شوکانی "فتح القدیر" جلد ۱ ص ۳۰۱، ۳۰۲ پر لکھتے ہیں:

"تنہا عورتوں کی شہادت مردوں کے بغیر غیر مقبول ہے سوائے ان معاملات کے جو عورتوں ہی سے مخصوص ہیں"۔

۳- تفسیر "روح المعانی" میں اس آیت کی تفسیر یوں درج ہے:

"ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت ہمارے نزدیک قصاص اور حدود کے علاوہ باقی تمام معاملات میں ہے جب کہ امام شافعیؒ اس آیت کو مالی معاملات سے خاص سمجھتے ہیں، اور امام مالکؒ حدود و قصاص کے علاوہ و لاء اور احصان میں بھی عورت کی شہادت کو جائز نہیں سمجھتے۔ البتہ وہ وکالت اور وصیت میں (بشرطیکہ اس میں غلام کی آزادی یعنی عتق کا مسئلہ نہ ہو) جائز سمجھتے ہیں۔ تنہا عورتوں کی شہادت کو وہ ولادت، بکارت، بچہ زندہ پیدا ہوا یا مردہ جیسے نسوانی مسائل میں قبول و جائز سمجھتے ہیں"۔ (جلد ا ص ۵۰)

۴- شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنی مشہور کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" جلد دوم ص ۳۴۴ پر تحریر کرتے ہیں:

"قصاص اور حدود میں صرف دو مردوں کی شہادت ہی قابلِ اعتبار ہے۔ اس کی اصل امام زہری کا یہ قول ہے "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے یہ طریقہ چلا آتا ہے کہ حدود کے معاملات میں عورت کی شہادت قبول نہیں کی جاتی"۔ البتہ مالی معاملات میں ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت قبول ہے۔ اور اس کی اصل سورۂ بقرہ کی آیت فَاِنْ لَّمْ یَکُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ" ہے۔ یعنی اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنا سکتے ہو) اور اللہ تعالیٰ نے دو عورتیں ہونے کی وجہ اپنے اس قول میں بیان فرما دی "اگر ان دونوں میں سے ایک چوک جائے تو ایک دوسری کو یاد دلائے۔ یعنی عورتیں ناقص العقل ہیں۔ پس عدد کی زیادتی سے اس کمی کو پورا کرنا ضروری ہوا۔

۵- مولانا امین احسن اصلاحی صاحب تدبر القرآن میں جلد ا ص ۵۹۷ پر رقمطراز

ہیں:۔

"اگر مذکورہ صفات کے دو مرد میسر نہ آسکیں تو اس کے لیے ایک مرد اور دو عورتوں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ دو عورتوں کی شرط اس لیے ہے کہ اگر ایک سے کسی لغزش کا صدور ہوگا تو دوسری کی تذکیر و تنبیہ سے اس کا سدباب ہو سکے گا۔ یہ فرق عورت کی تحقیق کے پہلو سے نہیں ہے، بلکہ اُس کی مزاجی خصوصیات اور اس کے حالات و مشاغل کے لحاظ سے یہ ذمہ داری اس کے لیے ایک بھاری ذمہ داری ہے۔ اس وجہ سے شریعت نے اس کے اُٹھانے میں سہارے کا انتظام فرما دیا ہے۔"

۶۔ شام کے معروف عالمِ دین ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی اپنی کتاب "المراۃ بین الفقہ و القانون" میں ص ۳۲ - ۳۳ پر تحریر کرتے ہیں:

"عورت کی نصف شہادت کا مسئلہ عزت، بے عزتی یا اہلیت اور عدمِ اہلیت کا نہیں، بلکہ حصولِ یقین کی بنا پر فیصلہ کرنے اور قضا میں احتیاط برتنے کا ہے فیصلہ کرتے وقت احتیاط کا دامن تھامے رکھنا ہر عادلانہ قانون کی ضرورت ہوا کرتا ہے۔"

ہم نے صرف بطور نمونہ چند قدیم اور چند جدید مفسرین کی تفسیروں سے اِس آیت کی وضاحت پیش کی ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام مفسرین دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کی جگہ ضروری اور اس کے برابر سمجھتے ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر خازن جلد ۱ ص ۲۵۸، احکام القرآن جلد ۱ ص ۲۵۵، ۲۵۶۔ بلکہ "تبیان القرآن" میں مولانا غلام وارث لکھتے ہیں کہ "کچہری کے استفسارات سے گھبرا کر اگر ایک کچھ کا کچھ کہہ دے تو دوسری ٹھیک بات بتا دے"۔ جلد اوّل۔ ص ۱۹۴۔

احادیث کی رُو سے مذکورہ آیت کی وضاحت

اب اس کے بعد قانونِ اسلامی کے دوسرے ماخذ یعنی حدیث کی طرف آیئے، کیونکہ سلف کا یہی طریقہ ہے کہ وہ قرآن کی مشکلات کی وضاحت حدیثِ رسولؐ سے کرتے ہیں، کیونکہ رسول کریمؐ سے بڑھ کر قرآن کے منشا و مفہوم

کو سمجھنے والا اور کوئی نہیں ہے صحیح بخاری میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

۱- شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ مِثْلُ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ (کتاب الحیض)

"عورت کی گواہی مرد کے مقابلے میں آدھی ہے"

۲- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے عورتوں کے گروہ! تم صدقہ و خیرات زیادہ کیا کرو...... میں نے تم سے زیادہ عقل و دین میں ناقص ہونے کے باوجود عقل مند مردوں کی مت مارنے والا کوئی نہیں دیکھا"۔ عورتوں نے سوال کیا یا رسول اللہؐ ہماری عقل اور دین کا کیا نقصان ہے"؟ آپؐ نے فرمایا" عقل کی کمی کا ثبوت یہ ہے کہ دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ہوتی ہے اور دین کا نقصان یہ ہے کہ عورتیں مخصوص ایام میں نہ روزہ رکھتی ہیں، نہ نماز ادا کرتی ہیں"۔ (صحیح مسلم)

۳- فَشَهَادَةُ امْرَأَتَيْنِ تَعْدِلُ شَهَادَةَ رَجُلٍ [صحیح مسلم عن ابی هریرة]

عورت کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے برابر ہے۔

عورت کی شہادت کا نصف ہونا ہی عین انصاف ہے۔ اب آیئے نقلی کے بعد عقلی دلائل کی طرف - یہ مسئلہ تفاوتِ مرد و زن کا ہے ہی نہیں، نہ اس میں کوئی حقوق و مساوات کی بحث ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ اسلام نے مرد و عورت کی شہادت[۲] کے درمیان فرق

---

[۱] آج کل اس حدیث کو ہی موضوع ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، مگر یہ دو تین سندوں سے مروی ہے، اس لیے کس کس سند کو موضوع کہا جائے گا۔ آخر بات کچھ تو ہے ہی جو مختلف حوالوں اور سندوں سے بیان ہوئی ہے۔

[۲] اس ساری صورتِ حال میں مسئلہ شہادت سرے سے زیرِ بحث ہی نہیں ہے۔ یہ تو بے حجابی کو، عریانی و فحاشی کو پاکستانی معاشرے میں فروغ دینے کی ایک شکل ہے، وگرنہ آج ہمارے معاشرے میں مالی معاملات میں بھی عورتوں کو گواہی دینے کی ضرورت کہاں (باقی برصفحہ آئندہ)

رکھا ہے۔ مگر اس فرق کو عورت کی توہین سمجھنا سراسر زیادتی ہے۔ یہ فرق خود عورت کے اپنے مزاج، فطرت، اس کے دائرۂ کار اور وظیفۂ حیات ہی کے اندر موجود ہے۔

۱۔ مزاج طبع | جذبات کی لطافت، وجدان کی نزاکت اور زود حسی ایسی خصوصیات ہیں جو عورت کے مزاج کا لازمی جزو ہیں۔ ان کے نتیجے میں عورت میں شدید جذباتیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہی جذباتیت ہی تو ممتا کی جان ہے جو بچے کی پرورش کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ بچے کی پرورش کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ جذباتی ہونی چاہئیں، تاکہ بچے کی ضروریات پوری کرنے کے موقع پر دل و دماغ سے سوچنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اور کسی سستی یا تاخیر کے بغیر عورت اس کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بے تابانہ اٹھ جائے۔ لیکن دوسری طرف

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

پیش آتی ہے۔ کتنے فیصد یا فی ہزار عورتیں عدالت میں جا کر گواہیاں بھگتاتی ہیں۔ یہ مسئلہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکی ہوں اُن خواتین کی طرف سے اٹھایا گیا ہے جنہوں نے علماء کرام کی ڈاڑھی کو "جنگل" کا نام دیا۔ زنا کے مجرم کو "مظلوم" گردانا اور شادی کو ایک "گھناؤنے بندھن" سے تعبیر کیا۔ دیکھیے روزنامہ جسارت ۱۰ر مارچ ۱۹۸۳ء۔

جو لوگ عورت کی شہادت کو مرد کے برابر کرنے کی سعیٔ لاحاصل میں مصروف ہیں۔ وہ بتائیں اگر مرد و عورت کی شہادت مساوی (۱ = ۱) تسلیم کر بھی لی جائے تو کیا اس سے عورت کی دفاتر میں بے حجابانہ ملازمت کا جواز مہیا ہو جائے گا، یا بے پردہ بازاروں میں پھرنے اور بن سنور کر نکلنے اور غیر مردوں سے اختلاط کی پابندی عورتوں پر سے اٹھ جائے گی۔

شریعت آپ کو از راہ لطف و کرم ایک گرانقدر ذمہ داری سے مستثنیٰ کر رہی ہے۔ اور آپ اس ذمہ داری کے عائد نہ کیے جانے پر سراپا احتجاج بنی ہوئی ہیں۔ اے ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے۔ اصل بات یہی ہے کہ ہماری محدود اور ناقص عقل میں اس کی حکمت سمجھ آئے یا نہ آئے یہ مسئلہ ہماری خواہشِ نفس کے خلاف ہی کیوں نہ پڑتا ہو۔ ہمارے ایمان کا یہی تقاضا ہے کہ اسے برضا و رغبت تسلیم کر لیا جائے۔

بہ جذباتیت گواہی کے لیے غیر موزوں بلکہ نقصان دہ ہے۔ وہاں تو عقلی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تحلیل و تجزیہ، سوچ بچار، درست مشاہدہ، درست قوتِ حافظہ اور بلا کم و کاست حالات کو بیان کرنا ضروری ہوتا ہے۔ عورت پڑھی لکھی بھی ہو، اکیلی کچہری جانے سے گھبراتی ہے وہ قاضی کی جرح سے پریشان ہو کر بھی غلط بات کہہ سکتی ہے۔ گھبرا کر بھول سکتی ہے۔ ویسے بھی عورت پر حیض، نفاس، حمل، زچگی اور رضاعت وغیرہ کے جو ادوار گزرتے ہیں وہ اس کی طبیعت میں چڑچڑاپن پیدا کر دیتے ہیں۔ اور چڑچڑے پن سے پھر وہی جذباتیت نمودار ہوتی ہے سید قطب شہیدؒ اپنی کتاب "اسلام اور جدید ذہن کے شکوک و شبہات" میں تحریر کرتے ہیں — "ہو سکتا ہے کہ وہ جس مجرم کے خلاف یا حق میں گواہی دے رہی ہو، وہ کوئی حسین عورت ہو اور وہ ضد اور جلاپے کی وجہ سے اس کے خلاف جھوٹی شہادت دے بیٹھے۔ اسی طرح یہ بھی عین ممکن ہے کہ ملزم کوئی نوعمر مرد ہو جس کو دیکھ کر گواہ کی ممتا بیدار ہو جائے اور وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کو بچانے کی کوشش میں کوئی خلافِ حقیقت گواہی دے بیٹھے۔ مگر جہاں دو عورتیں بیک وقت عدالت میں گواہی دے رہی ہوں وہاں پر ان دونوں کا ایسی غلطی میں مبتلا ہو جانا اور غلط شہادت دینا بعید از قیاس ہے کہ جہاں ایک حقیقت کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو گی، وہاں دوسری عورت اس کی اصلاح کر دے گی۔ اس طرح شہادت کے غلط ہونے کا امکان دُور کیا جا سکے گا"۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ملزم کوئی بارُعب شخصیت ہو اور وہ اس کے رُعب تلے دب کر خلافِ حقیقت بیان دے بیٹھے تو پھر دوسری اس کی اصلاح کر دے گی —— چنانچہ ماہر نفسیات ہیولاک ایلس (HEOLOCK ELLIS) اپنی کتاب "مرد و عورت" میں لکھتا ہے: "عورتوں میں بہ نسبت مردوں کے تاثر و انفعالیت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے"۔ ایک اور مشہور مغربی فلاسفر "پرودھن" اپنی کتاب "ابتکار الانتظام" میں لکھتا ہے۔ "عورت کے حواس خمسہ مرد کے حواس سے ضعیف تر ہیں"۔ "مرد کے مغز کا وزن عورت کے مغز سے سو (۱۰۰) ڈرام زیادہ تر ہے"۔

۲- سہو و نسیان | یہ بھی عورت کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ چابیاں رکھ کر سارے گھر میں ڈھونڈتے پھرنا عورتوں کی ایک عام مجبوری ہے۔ ایک ہی واقعہ کو مرد دس بار بیان کرے تو وہ کم و بیش

ایک ہی جیسے الفاظ بیان کرے گا۔ مگر عورت ایک واقعہ کو دس بار بیان کرے تو ہر دفعہ کچھ نہ کچھ کمی بیشی کرتی جائے گی۔ چنانچہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی مذکورہ بالا آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں: "رہا یہ سوال کہ عورت کی شہادت مرد کے مقابلے میں ضعیف کیوں ہے اور نسیان کا احتمال مرد کی شہادت میں کیوں نہیں رکھا گیا۔ تو یہ سوالات دین و اخلاق کی دنیا میں ایسے ہی ہیں جیسے جسم و مادیات کی دنیا میں یہ دریافت کیا جائے کہ حمل و رضاعت کا تعلق عورت ہی سے کیوں رکھا گیا ہے اور مرد کو باوجود اس کی قوت و جسامت کے اس بار کے قابل کیوں نہیں سمجھا گیا فاطر کائنات ظاہر ہے کہ جسمیات و مادیات کے ایک ایک دانہ سے واقف ہے۔ اس کے پیش نظر ذہنیات و اخلاقیات کی باریک سے باریک حقیقتیں تھیں، بلکہ مغرب کے ایک ماہر نسائیات ہیولاک ایلز (HEOLOCK ELLIS) نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ "عورت کے لیے دھوکا اور فریب تقریباً طبعی امر ہے۔"

۳۔عورت کا دائرۂ کار | کسی حقیقت کی رسائی تک جتنا دخل آدمی کی فکر و فہم کو ہوتا ہے، اتنا ہی اس کے طبعی ذوق اور عملی دائرۂ کار کا بھی ہوتا ہے۔ ایک ہی واقعہ کسی کے دامنِ توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ پھر وہ اس کی تہہ تک پہنچنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ مگر دوسرا شخص اس واقعہ کے پاس سے سرسری طور پر گزر جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اُس کی طبیعت یا دائرۂ کار سے غیر متعلق ہوتا ہے۔ ایک کاروباری آدمی علمی مسائل کو اتنی تیزی سے نہیں سمجھ سکتا جس طرح کہ ایک طالب علم۔ یہی حال عورت کا ہے۔ اس کا ذہنی مزاج اور اُس کے عمل کی دُنیا دونوں مرد کے مزاج اور دائرۂ کار سے الگ ہیں، لہٰذا وہ اپنے دائرۂ کار کے اندر ہونے والے واقعات کا تو بخوبی مشاہدہ کر سکتی ہے اور عمدگی سے ان کو ضبط میں رکھ سکتی ہے۔ مگر اپنے حدودِ عمل سے باہر ہونے والے واقعات کا نہ تو وہ مرد کی طرح مشاہدہ کر سکتی ہے، نہ اس کی طرح ضبط رکھ سکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود شریعت نے اُس کی حدودِ عمل سے باہر ہونے والے معاملات میں بھی اُس کی شہادت قبول کی ہے۔ مگر سہو و نسیان کے احتمال کے پیش نظر دوسری عورت کی موجودگی لازمی قرار دے دی۔

روزمرہ کے مشاہدات بہت سے روزمرہ کے مشاہدات ایسے ہیں جن سے حقیقتِ حال کا اندازہ ہوتا ہے:

— اگر کہیں مرد وکیل بھی ہو اور عورت وکیل بھی، تو آپ مرد وکیل کو چنیں گے یا اپنا مقدمہ عورت وکیل کے حوالے کر دیں گے۔

— عورتیں خود یہ بات اچھی طرح جانتی ہیں کہ وہ کچہری جانے سے کتنا گھبراتی ہیں۔ اگر بامر مجبوری جانا ہی پڑے تو کسی نہ کسی مرد کو ساتھ لے کر جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ خوب پڑھی لکھی عورتیں بھی کچہری جانے سے گریز ہی کرتی ہیں۔ اور جج کی تفتیش سے حواس باختہ ہو جاتی ہیں۔

— مرد اکیلا ہر جگہ چلا جاتا ہے جب کہ عورت جہاں بھی جائے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی مرد ساتھ ہو، چاہے اپنا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

— بچہ بیمار ہو، باپ پُرسکون ہوگا۔ مگر ماں کا حال ناگفتہ بہ ہوگا۔ اسی طرح خدانخواستہ بچہ فوت ہو جائے تو باپ بہادری اور صبر سے سہہ لیتا ہے، جب کہ ماں کو بار بار غشی پڑتی جاتی ہے۔

— مرد معاملات کا تجزیہ بنظرِ غائر کرتا ہے، جب کہ عورت تجزیہ کرنے سے گھبراتی ہے۔ وہ بہت جلد جذبات کی رَو میں بہہ کر یک طرفہ فیصلہ کر ڈالتی ہے۔

— نکاح، شادی، طلاق وغیرہ کے معاملات میں عورت (۲ : ۱) گواہ بن سکتی ہے، مگر ترجیح مرد ہی کو دی جاتی ہے۔ خود عورت مرد ہی کو گواہ بنا کر خوش ہوتی ہے۔

— ذرا اور آگے چلیے، لیڈی ڈاکٹروں کی کمی نہیں، مگر خود مرد حضرات چاہتے ہیں کہ ان کی بیویوں کی زچگیاں مرد ڈاکٹروں سے سرانجام پائیں محض اس وجہ سے کہ عورت کی نسبت مرد زیادہ کامیاب اور محتاط [illegible] کر سکتے ہیں۔

یہ مشاہدات کہاں تک گنوائے جائیں۔ خود ہماری روایات بھی ایسی ہی ہیں کہ عورت ہر ذمہ داری اور احتیاط کا کام مرد کے حوالے کر کے مطمئن ہو جاتی ہے۔ مرغی تک بھی وہ خود ذبح نہیں کرتی، اس کے لیے بھی وہ مرد ہی کی تلاش میں رہتی ہے۔ اسلام نے عورت کی

مالی حیثیت کو تسلیم کیا ہے، وہ کما سکتی ہے۔ اپنی جائیداد اور کمائی میں خود تصرف کر سکتی ہے، مگر عملاً مشاہدہ یہی ہے کہ وہ اپنے مالی معاملات بھی سارے کسی نہ کسی مرد ہی کے حوالے کر دینا چاہتی ہے۔ یہ سب حقائق اس بات کے لیے مضبوط دلائل ہیں کہ عورت کی گواہی مرد کے مقابلے میں آدھی کیوں رکھی گئی ہے۔ بقول اقبالؒ

"نسوانیتِ زن کا نگہبان ہے فقط مرد"

اب آیئے مغربی معاشرہ کی طرف جہاں کی عورت مشرقی عورت کی نسبت زیادہ بے باک ہے اور ذمہ داری سے اپنی دفتری ڈیوٹیاں بھی انجام دیتی ہے، اس کو خود اعتماد ہونے کا دعوٰی ہے، مگر عملاً صورتِ حال یہی ہے کہ اہلِ مغرب کے تمام دفاتر، تجارتی مارکیٹیں، بازار، تقریباً ہر جگہ مرد ہی چھایا ہوا ہے، ہر جگہ مرد کا تسلط ہے، عورت اس کے ماتحت کام کرتی ہے۔ ملازمتوں میں عورت کی شرح ایک تہائی بھی تسلیم کر لی جائے تب بھی یہ بات مسلّمہ ہے کہ وہ ذمہ داری کا کوئی منصب عورت کے حوالے نہیں کرتے۔ ایک ہی پوسٹ پر مرد و عورت تعینات ہوں تو کارکردگی کا مجموعی تناسب مرد کا زیادہ اور عورت کا کم ہوتا ہے۔ اگر کارکردگی کا تناسب یکساں یا بالفرض استثنائی حالات میں کہیں زیادہ ہو بھی جائے تو تنخواہ عورتوں کی مردوں کے مقابلے میں کم ہی ہوتی ہے۔ عورت کی پستی، توہین اور حقارت کا تصور ان کے ذہنوں میں برابر جاگزیں ہے۔

LEE. H. BOWKER اپنی کتاب "WOMEN AND CRIME IN AMERICA" کے صفحہ ۲۵۹ پر لکھتا ہے:

"بچوں کی نظمیں، پریوں کی کہانیاں، دیو مالائی افسانے، قانونی کتب، بچوں کی کہانیاں جو بچوں کو ہفتہ کے ساتوں دن یاد کرائی جاتی ہیں، ان سب میں ایسی ہی باتیں موجود ہوتی ہیں، جن میں عورتوں کو پست مخلوق کی طرح دکھایا جاتا ہے۔" مشہور انگریز ادیب "چارلس لیمب" بچوں کی مندرجہ ذیل نظم کو بہت پسند کرتا تھا۔ یہ نظم بھی بچوں کو ہفتے کے ساتوں دن یاد کرانے کے لیے لکھی گئی تھی۔ اور اسکولوں میں عام رائج تھی۔ بلکہ چارلس لیمب اپنے دوستوں کو

بھی خطوں میں لکھ لکھ کر یہ نظم بھیجا کرتا تھا۔ نظم مندرجہ ذیل ہے:

I MARRIED A WIFE ON SUNDAY
SHE BEGAN TO SCOLD ON MONDAY
BAD WAS SHE ON TUESDAY
MIDDLING WAS SHE ON WEDNESDAY
WORSE WAS SHE ON THURSDAY
DEAD WAS SHE ON FRIDAY
GLAD WAS I ON SATURDAY NIGHT
TO BURY MY WIFE ON SUNDAY

ی۔ایچ۔ باؤکر کے مندرجہ بالا اقتباس کو اور خصوصاً بچوں کی اس نظم کو پڑھیے اور سر دُھنیے کیا یہی وہ مقام ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے ہماری بیگمات کا طبقہ اتنا بےتاب و بےقرار ہے ---؟

(باقی)

اُستاذ العلماء ـــــ مولانا محمد چراغ کی یاد میں

جناب پروفیسر محمد اسلم اعوان

(۳)

مولانا صاحب کے شاگرد سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد اپنے اپنے حلقہ میں اقامتِ دین کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور ان میں سے اکثریت تحریکِ اسلامی کے فعال کارکنان پر مشتمل ہے ـــ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندے سے خدمتِ دین کا کام لینے کے لیے پچانوے سال کی طویل عمر عطا فرمائی ـــ چنانچہ آپ نے ستر سال تک تدریس کا کام کیا اس لیے آپ کے تلامذہ میں اکثریت ایسے علماء کرام کی ہے جن کی دو دو نسلوں نے آپ سے کسبِ فیض کیا ـــ اور علماء کے بعض خانوادوں کی تین تین نسلیں بھی آپ کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئیں ـــ مولانا غلام محمد مہتمم دارالعلوم موضع مرہانہ ضلع سیالکوٹ کا گھرانہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جن کی تین نسلوں یعنی باپ، بیٹے اور پوتے نے بھی اسی عالی مرتبت اُستاد سے فیضِ علمی حاصل کیا۔ آپ کے شاگردوں کی فہرست تو بہت طویل ہے لیکن چند ایک نمایاں نام یہ ہیں:

مولانا عبدالخالق طارق ڈائریکٹر اسلامی انسٹی ٹیوٹ یوگنڈا، مفتی عبدالواحد مرحوم مہتمم انوارالعلوم شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ، قاضی عصمت اللہ مہتمم مدرسہ جامعہ محمدیہ قلعہ دیدار سنگھ ضلع گوجرانوالہ، مولانا عبدالعلیم قاسمی، مولانا عبدالحلیم قاسمی دارالعلوم احناف ماڈل ٹاؤن، لاہور، مولانا سید لال شاہ بخاری واہ کینٹ، مولانا اسلم حیات مہتمم جامعہ عربیہ گجرات، مولانا محمد منظور چنیوٹی، ایم پی۔ اے (پنجاب اسمبلی)، مولانا محمد حیات فاتح قادیان، مولانا تمیزالدین سرکار مشرقی پاکستان موجودہ بنگلہ دیش ـــ یہ فہرست تو ہزاروں علماء پر مشتمل ہے جس کا متحمل یہ مضمون نہیں ہو سکتا۔

مشرقی پاکستان کے ذکر سے یاد آیا کہ جمعیت اتحاد العلماء کی تنظیم کے سلسلے میں آپ مولانا گلزار احمد مظاہری مرحوم کو ساتھ لے کر ۱۹۶۶ء میں بنگلہ دیش گئے تو وہاں کی بستی بستی، شہر شہر کے علمائے کرام کے حلقوں میں "العرف الشذی" کے مؤلف کی آمد کی حیرت انگیز انداز میں دھوم مچ گئی۔ یہاں یہ پس منظر سامنے رہے کہ سابق مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) میں دینی تعلیم کے حصول کا جذبہ پاکستان کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ اور مشہور محقق پروفیسر سید محمد سلیم کے انتہائی متوازن اور محتاط جائزے کی رو سے پاکستان اور بنگلہ دیش میں دینی تعلیم کے حصول میں طلباء کا تناسب ایک اور چھ کی نسبت سے ہے۔ یعنی یہاں کل پاکستان میں دینی مدارس کے طلبا کی تعداد ایک لاکھ اور مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں چھ لاکھ ہے۔ (بحوالہ ہندو پاکستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت از پروفیسر سید محمد سلیم۔ ص-۱۵)

بنگلہ دیش میں آپ کی آمد کے وقت علماء کے حلقوں میں تحیّر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ بنگلہ دیشی علماء کی اکثریت کے سان گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ ان کے زیرِ مطالعہ رہنے والی کتاب "العرف الشذی" کا مؤلف جس نے بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں علامہ انور شاہ سے صحیح معنوں میں استفادہ کر کے اس شاہکار شرح کو تالیف کیا۔ وہ مؤلف آج اسی صدی کے ساتویں دہے میں بھی زندہ ہوگا۔۔ ان کا خیال تھا کہ شاید "العرف الشذی" کا مؤلف بھی اپنے شیخ شاہ صاحب کے بعد کے لگ بھگ کے زمانے میں کہیں چل بسا ہوگا۔۔ لیکن مولانا محمد چراغ رح کی آمد سے پورے مشرقی پاکستان کی علمی دنیا میں ایک علمی بہار اور عید کا سماں پیدا ہوگیا۔ اور بنگلہ دیش کے گوشے گوشے سے علمائے کرام کی اکثریت آپ کے دیدار سے بہرہ یاب ہونے کے لیے اُمڈ آئی تاکہ کل وہ اپنے تلامذہ کے سامنے فخر سے کہہ سکیں کہ ہم نے جیتی جاگتی آنکھوں سے "العرف الشذی" کے مؤلف کی زیارت کی ہے!!! علمائے کرام آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے شرفِ شاگردی بخشنے کی آپ سے درخواست کی۔ چنانچہ مولانا اطہر علی خان مرحوم کے مدرسہ جامعہ امدادیہ کشور گنج میں پورے مشرقی پاکستان سے ہزاروں علماء کرام

جمع ہوئے اور آپ نے اُن کو حدیث کا ایک مختصر حصّہ پڑھا کر ان کی آرزو کو پورا کیا۔ اور مشرقی پاکستانی علماء نے بھی جمعیت اتحاد العلماء کی تنظیم میں آپ کا بھرپور ساتھ دیا۔" العرف الشذی" کے علمی کارنامے کے حوالے سے آپ کا شاگرد بننے کی آرزو لے اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے موجودہ مصری نژاد وائس چانسلر ڈاکٹر حسن شافعی (فاضل الازہر یونیورسٹی) جامعہ عربیہ گوجرانوالہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے ایک حدیث شریف پڑھ کر آپ کے شاگردوں کی فہرست میں فخر و انبساط سے شامل ہوئے۔

مولانا محمد چراغ کا اندازِ تدریس انتہائی دل نشین تھا۔ دورانِ تدریس عصری تقاضوں کا شعور اور تحریکِ اسلامی کی اہمیت اس طرح سمو دیتے کہ اُن کے طلبا علم حاصل کرنے کے بعد دین کے متحرک سپاہی بن کر نکلتے۔ طلباء سے انتہائی شفقت سے پیش آتے اور اُن سے یُوں برتاؤ کرتے کہ طلباء خود کو گھریلو ماحول میں محسوس کرتے۔ ان کے ایک شاگرد مولانا اسلم حیات مہتمم جامعہ عربیہ جی۔ٹی روڈ گجرات بیان کرتے ہیں کہ ۳۷-۱۹۳۶ء میں مَیں جامعہ عربیہ گوجرانوالہ میں استادِ گرامی کے زیرِ تعلیم و تربیت تھا۔ اُن دنوں جامعہ عربیہ کی عمارت اندرون شہر کھیالی دروازہ کے باہر تھی۔ اُن دنوں کھیالی دروازہ سے باہر آبادی بالکل نہیں تھی۔ دُور دُور تا حدِ نظر کھیت ہی کھیت دکھائی دیتے۔ مولانا اپنے شاگردوں کے ہمراہ گوجرانوالہ کے باہر مضافات نوشہرہ سانسی روڈ جانے والی سڑک پر طویل سیر کو نکل جاتے اور لمبی دوڑ لگاتے اور چونکہ علماء کی عام روش کے برعکس چھریرے بدن کے مالک تھے اس لیے دوڑ میں سب سے آگے نکل جاتے۔ لیکن طلباء کے معاملے میں شفقت کے ساتھ ساتھ استاذِ محترم تربیت میں بہت سخت گیر تھے۔ اور نماز باجماعت کے لیے طلبا پر بہت پابندی اور سختی کرتے اور ہر طالب علم کو فجر کی نماز کے لیے خود جگاتے اور تدریس میں اخلاص کا یہ عالم کہ نماز فجر کے بعد سے ظہر تک پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھتے۔ فرائض منصبی میں اتقا کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کسی دن سفر پر جانا ہوتا تو اذانِ فجر سے بہت پہلے طلباء کو جگا کر اُس دن کا سبق نماز فجر سے

پہلے ہی پڑھا دیتے ۔ تاکہ طلباء کا حرج نہ ہو۔ فرمایا کرتے کہ عالمِ دین کو مالی معاملات میں بہت صاف اور دیانت دار ہونا چاہیے ۔ اُن کے صاحبزادے حافظ محمد انور قاسمی مہتمم جامعہ عربیہ بیان کرتے ہیں کہ مالی اُمور میں والد صاحب انتہائی سخت گیر تھے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۵۹ء میں، مَیں اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ لاہور میں معلم تھا کہ ماریشس کے شہر روز ہل (ROSE HILL) کی اسلامی سرکل نامی انجمن نے مجھے تبلیغِ اسلام کے لیے مع خاندان ماریشس آنے کی دعوت دی ۔ اُس وقت قاعدہ یہ تھا کہ پاسپورٹ کے لیے فی کس دو ہزار روپے سیکورٹی جمع کرانا پڑتی تھی ۔ چونکہ میں اپنی اہلیہ کو بھی ساتھ لے جارہا تھا لہٰذا مجھے چار ہزار روپے کی ضرورت تھی ۔ اُن دنوں دو ہزار روپے کی رقم بہت زیادہ شمار ہوتی تھی ۔ گویا کہ مَیں اس سے دُگنی رقم کا ضرورتمند تھا ۔ چنانچہ میں نے ابا جان سے کہا کہ مجھے ماریشس جانے کے لیے چار ہزار روپے جامعہ عربیہ کے مالیات میں سے دے دیں ۔ ماریشس پہنچنے کے بعد میں یہ رقم آہستہ آہستہ آپ کو بھجوادوں گا ۔ لیکن ابا جان نے صاف انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ " جامعہ کے مالیات میں سے ایک پیسہ دینے کا بھی روادار نہیں "۔ میں نے عرض کیا کہ جامعہ کی شوریٰ کے احباب سے مشورہ و فیصلہ کے بعد یہ رقم دے دیں "۔ فرمایا " اگر شوریٰ رقم دینے کے بارے میں کہہ بھی دے تو پھر بھی اپنے بیٹے کے لیے جامعہ کا پیسہ نہیں دوں گا "۔ چنانچہ میں نے ماریشس کی انجمن کو لکھا تو وہاں سے رقم آگئی ۔ یہ واقعہ سُنانے کے بعد انور صاحب نے فرمایا کہ ابا جان کے انکار میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت پوشیدہ تھی کہ جہاں اس سے مولانا کی دیانت سامنے آگئی وہیں یہ رقم ماریشس سے ۱۹۶۳ء میں میری واپسی پر مجھے پھر سیکورٹی کی صورت میں واپس مل گئی ۔

اللہ تعالیٰ نے اُن کو صحیح متوازن اور ملتِ اسلامیہ کا غمخوار ذہن عطا فرمایا تھا ۔! میں یہاں فقہی مباحث کے خارزار میں اُلجھنا نہیں چاہتا لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ آج مسلکوں کی بنیاد پر ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے والے، ایک دوسرے کی اقتدار میں نماز نہ پڑھنے والے ایسے علما ر لیڈر ہمارے اِرد گرد نظر آرہے ہیں جو اُمتِ مسلمہ

کی رہنمائی کی دعویداری میں اُمت میں روز افزوں افتراق کے بیج بو رہے ہیں۔ اِن حالات میں مولانا محمد چراغؒ کی ذات ہی ہماری اُمیدوں کا محور تھی۔ جنہوں نے متحدہ قومیت کے پلیٹ فارم کو مسلمانوں کے لیے سمّ قاتل خیال کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ کی آواز پر لبیک کہا اور ساری عمر اقامتِ دین اور اسلامی نظامِ حکومت کے غلبے کے لیے شاگردوں کی ایسی سپاہ تیار کرنے میں بسر کر دی جو عصری تقاضوں کا شعور رکھنے کے ساتھ فرقہ پرستی کے زہر سے بالکل مبرا ہو۔ چنانچہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بھی ان کا بے پایاں احترام کرتے تھے۔ اور ان کے علمی منصب کے مقام شناس تھے اور علمی معاملات اور تصنیف و تالیف میں ان کے مشوروں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی رائے سے رجوع بھی کر لیتے۔

مولانا محمد چراغ صاحب کے مطالعہ کُتب کا ایک خاص انداز تھا۔ زیرِ مطالعہ کُتب میں جس چیز کو اہم سمجھا اُس کے نیچے لکیر لگا دی یا اُس کے حاشیہ پر لکھ دیا کہ اس قسم کا مضمون فلاں کتاب میں بھی ہے۔ اِس طرح اُن کی مطالعہ شدہ کتاب کو پڑھتے ہوئے انسان یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ بیک وقت ایک کتاب نہیں، بلکہ چار پانچ کتابیں پڑھ رہا ہے۔ عربی زبان کی مشہور تفسیر ”روح المعانی“ از علامہ آلوسی (بغداد) کے حاشیہ پر بھی مولانا نے اسی طرح کے نوٹ لکھے۔ چنانچہ مولانا مودودیؒ نے مولانا محمد چراغؒ کی مطالعہ شدہ ”رُوح المعانی“ دیکھی تو ”روح المعانی“ کے اپنے مملوکہ نسخہ سے اس کا تبادلہ کر لیا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ مولانا محمد چراغ جماعتِ اسلامی کے رُکن نہ تھے۔ لیکن علمائے کرام کی صفوں میں سے جماعتِ اسلامی کا ساتھ دینے کے لیے سب سے اوّل اور نمایاں آپ ہی تھے فرمایا کرتے ”مجھے جماعتِ اسلامی سے زیادہ مولانا مودودیؒ مظلوم دکھائی دیتے ہیں“[1]

[1] مولانا محمد چراغ کے یہ الفاظ پڑھتے ہوئے اس تلخ حقیقت کا پس منظر ذہن میں رہے کہ یہود و ہنود، مستشرقین، کمیونسٹوں اور فاد یانیوں کے علاوہ شومئ قسمت سے اور غلط فہمیوں کی بنا پر اپنوں یعنی مذہبی طبقہ اور علماء کا ایک معتدبہ حصہ گذشتہ نصف صدی سے (باقی بر صفحہ آئندہ)

مولانا محمد چراغ نے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے جس اخلاص نیت سے زندگی کے ہر شعبے میں اسلام نافذ کرنے کی جدوجہد کرنے والی تحریک جماعت اسلامی کا ساتھ دیا اور اس مشن کی تکمیل کے لیے بے لا تعداد علمائے کرام تیار کیے۔ انشاء اللہ العزیز ان کی جدوجہد سے جب اسلامی انقلاب کا سورج طلوع ہوگا تو عامۃ المسلمین ایسے خاندانوں پر رشک کریں گے، جن کے افراد نے مولانا محمد چراغؒ کی زیارت کی ہوگی !!! بقول اقبال ؎

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام　　جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ　　عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو　　عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل　　اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نقطۂ پرکار حق مرد خدا کا یقین　　اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ

ماخذ:۔ زبانی گفتگوئیں: مولانا محمد انور قاسمی صاحب فرزند مولانا محمد چراغ و مہتمم جامعہ عربیہ، گوجرانوالہ۔ ۲۔ مولانا اسلم حیات شاگرد مولانا محمد چراغ مہتمم جامعہ عربیہ گجرات۔
۳۔ مولانا محمد زمان صاحب تلمیذ خطیب پاکستان آرمی۔

کتابیات:۔ ۱۔ "معاصرین اقبال کی نظر میں" از محمد عبداللہ قریشی۔ ۲۔ "مہک" مجلہ گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ جوبلی نمبر و گوجرانوالہ نمبر۔ ۳۔ مولانا محمد چراغ سے ملاقات پر مبنی مضمون از فاروق سلیمی، مطبوعہ "قومی ڈائجسٹ" سید مودودیؒ نمبر جنوری ۱۹۸۰ء۔ شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا قسط نمبر ۱۴۔ مضمون جمعیت اتحاد العلماء، از مولانا محمد حنیف۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

مولانا مودودیؒ کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈے کے "کار خیر" میں مصروف ہے !!!

قومیّت اور وطنیّت کی تحریک کا فروغ

اور

اس کا اسلامی حل

(۴)

جناب پروفیسر سیّد محمد سلیم صاحب

انسان کی حقیقت قومیت اور وطنیت کے مسئلہ کا حل اسلام کے پاس ہے۔ یہ حل اس بات کے جاننے پر منحصر ہے کہ دنیا میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟ اور انسانی زندگی کی اسکیم کیا ہے؟ سارا اختلاف اسی میں ہے۔ ساری برائیوں کی جڑ یہی اختلاف ہے۔ انسان کیا ہے؟ کیا مشین اپنا مقصد اور غرض وغایت بیان کرسکتی ہے؟ ہرگز نہیں؟ اس لیے انسان کی حقیقت اور انسان کا مقصد بیان کرنے کی تمام کوششیں اور کاوشیں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارنے کے برابر ہے۔ قدیم فلسفی ہوں یا جدید ان کی ایسی ساری کوششیں غلط ہیں۔ حقیقت سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ مشین کی حقیقت کو مشین کا کاریگر بیان کرسکتا ہے۔ انسان کی حقیقت کو انسان کا خالق اللہ تعالیٰ بیان کرسکتا ہے۔ یہ علم اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو بھیجا ہے۔

قرآن مجید بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے۔ ساری مخلوقات میں انسان کو اشرف اور اعلیٰ مرتبہ دیا ہے۔ اس کو بہترین صلاحیتوں اور استعدادوں سے نوازا ہے۔ ہر قسم کی اشیاء اور وسائل اس کے دستِ تصرّف میں دے دیئے ہیں۔ استعمال کی صلاحیت اور تسخیر کرنے کی قوت انسان کے اندر ودیعت کر دی

ہے۔ ان انعامات اور صلاحیتوں کی آزمائش مقصود ہے۔ انسان دنیا میں ایک امتحان گاہ میں ہے۔ حسنِ کارکردگی میں اس کا امتحان لیا جارہا ہے۔ مرنے کے بعد آخرت، موجودہ زندگی کا تسلسل ہے۔ وہاں امتحان کا نتیجہ ظاہر کیا جائے گا۔ جس کے بعد مزید انعامات و اکرامات یا تادیب و عذاب۔ یہ طبعی خلافت ہے۔ اس میں کافر اور مومن، کالے اور گورے سب شریک ہیں۔ جو بھی کوئی انسان ہے وہ اللہ کا خلیفہ ہے۔ وہ اسباب و وسائل استعمال کر رہا ہے۔ وہ امتحان دے رہا ہے۔ خواہ اس کو شعور ہو یا نہ ہو۔

خلافت کی دوسری قسم ہادیانہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے طبعی اور عقلی رہنمائی سے زائد انبیاء کرام کے ذریعہ نوعِ انسانی کو ہدایات بھیجیں۔ اعمالِ خیر اور اعمالِ شر کا فرق بتایا۔ پاکیزہ زندگی اور خراب زندگی کا فرق بتایا۔ کامیابی کے اعمال اور ناکامی کے اعمال بتائے۔ اب جو لوگ انبیاء کی تعلیمات پر ایمان لائے۔ نیک اور صالح زندگی اختیار کی۔ برائی اور بداعمالی سے اجتناب کیا۔ وہ آخرت میں کامیاب اور بامراد قرار دیئے جائیں گے۔ اس لیے جو لوگ انبیاء کی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں وہ سچے مومن اور سچے خلیفہ ہیں۔ انسان کسی نسل، کسی قوم کا ہو، کوئی بھی زبان بولتا ہو، انبیاء کی تعلیمات پر ایمان لا کر سچے مومنوں اور سچے خلفاء کے زمرہ میں شامل ہو سکتا ہے۔ خارج کی کوئی شے اہمیت نہیں رکھتی ہے داخل میں ایمان و اعمال کی اصل اہمیت ہے۔

زبان، نسل اور رنگ کے اختلافات کو اسلام بطور امرِ واقعہ کے تسلیم کرتا ہے اور ان کو بطور شناخت استعمال کرتا ہے۔

"اے انسانو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔" (حجرات - ۱۳)

آخری حج کے موقع پر ہزاروں صحابہ کے مجمع میں آپؐ نے اعلان کیا۔

"نہ کسی عرب کو غیر عرب پر کوئی فوقیت حاصل ہے۔ اور نہ کسی غیر عرب

کو عرب پر فوقیت حاصل ہے۔ نہ کالے کو گورے پر اور نہ گورے کو کالے پر۔ ہاں! فضیلت کا معیار تقویٰ ہے۔ اے انسانو! تمہارا رب ایک ہے۔ تمہارا باپ ایک ہے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا تھا۔"

قوموں اور قبیلوں کا مقصد اسلام کے نزدیک صرف تعارف ہے، شناخت ہے۔ شناخت کے لیے ہم "لال گائے اور کالی گائے" کہتے ہیں، مگر گائے کی قدر و قیمت دودھ سے ہے۔ شناخت کے لیے ہم "لال کوٹھی اور گمٹی والا مکان" کہتے ہیں۔ مگر مکان کی قدر و قیمت اس کی مکانیت، موزونیت، آسائش، ساخت وغیرہ بہت سے امور سے ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان کی قدر و قیمت اعمال سے ہے، پرہیزگاری سے ہے۔

اپنی قوم اور اپنے قبیلہ سے محبت کرنا بھی منع نہیں ہے۔ محبت کرنا فطری تقاضا ہے۔

"ایک صحابیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا عصبیت کیا چیز ہے؟ کیا آدمی کا اپنی قوم سے محبت کرنا عصبیت ہے؟ اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "نہیں، عصبیت یہ ہے کہ آدمی ظلم میں اپنی قوم کا ساتھ دے"۔ (ابن ماجہ)

جس بات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عصبیت قرار دے رہے ہیں وہ وہ جذبہ ہے جس کے تحت ایک آدمی بول پڑتا ہے۔

"میری قوم حق پر ہو یا ناحق پر ہو (MY COUNTRY RIGHT OR WRONG)"۔ اس عصبیت کی جو ناحق کو بھی حق بنا دیتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مذمت فرمائی ہے۔

"جس شخص نے عصبیت پر جان دی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔
جس شخص نے عصبیت کی دعوت دی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔
جس شخص نے عصبیت پر جنگ لڑی وہ ہم میں سے نہیں ہے"۔

(ابن ماجہ)

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جذبہ کی تعریف کی ہے جو ناحق سے جنگ پر ابھارے خواہ ناحق پر بھائی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معیاری اور مثالی دور میں صرف ایمان اور تقویٰ معیار تھے۔ اسی بنا پر حبش کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ اور فارس کے سلمانؓ کو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تقرب میں جگہ ملی۔ اور حقیقی چچا ابولہب ہاشمی قریشی ایمان نہ لانے کے سبب مردود قرار پایا۔ قرآن مجید میں اگر کسی مخالف کا نام لے کر مذمت کی گئی ہے تو وہ ابولہب ہے۔ اس سے صاف واضح ہوجاتا ہے کہ کلمہ کا رشتہ، اور نظریاتی رشتہ خونی رشتہ سے افضل ہے۔ اس حقیقت کا عملی مظاہرہ اسلام کی پہلی جنگ بدر میں ہوا۔ حضرت حذیفہؓ اپنے والد کے مقابلہ پر، حضرت ابوبکرؓ اپنے بیٹے کے مقابلہ پر اور حضرت عمرؓ اپنے ماموں زاد بھائی کے خلاف محاذ آرا ہوگئے۔ گرفتار شدگان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس، داماد عمرو بن عاص، چچا زاد بھائی عقیل بن ابی طالب مسجد میں ستونوں سے بندھے ہوئے تھے۔ نظریاتی رشتہ نے خونی رشتہ کو ختم کر دیا تھا۔

شریعتِ الٰہی اور قوم پرستی کا فرق

۱۔ وسیع تعاون | شریعتِ الٰہی کا مقصد ہمیشہ یہ رہا ہے کہ انسانوں کے درمیان اخلاقی اور روحانی رشتے قائم کرکے انہیں وسیع پیمانہ پر ایک دوسرے کا معاون بنائے، مگر نیشنلزم نسلی اور وطنی امتیاز کی قینچی سے کر ان رشتوں کو کاٹ دیتا ہے اور قومی منافرت پیدا کرکے انسانوں کو ایک دوسرے کا معاون بنانے کے بجائے مزاحم اور دشمن بنا دیتا ہے۔

۲۔ آزادانہ تعلقات | شریعتِ الٰہی چاہتی ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان آزادانہ ربط کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کیے جائیں کیونکہ ان ہی پر انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی کا انحصار ہے۔

مگر قوم پرستی ان روابط کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔ یعنی کہ ایک قوم کے حلقۂ اثر میں دوسری قوم والوں کے لیے سانس لینا تک مشکل کر دیتی ہے۔ قوم پرستی کے

ماحول میں کوئی طارق الارض للّٰہ و الملک للّٰہ کا نعرہ نہیں لگا سکتا۔

۳۔ قابلیتوں کا نشو ونما | شریعتِ الٰہی کا منشا یہ ہے کہ ہر فرد، ہر قوم اور ہر نسل کو اپنی طبعی خصوصیات اور پیدائشی قابلیتوں کے نشو ونما کا پورا موقع ملے تاکہ وہ مجموعی حیثیت سے انسانیت کی ترقی میں اپنا حصہ ادا کر سکے۔

مگر قوم پرستی ہر قوم اور ہر نسل میں یہ داعیہ پیدا کرتی ہے کہ وہ طاقت حاصل کر کے دوسری قوموں اور نسلوں کو ادنیٰ، ذلیل اور بے قدر و قیمت قرار دے اور انہیں غلام بنا کر ان کی پیدائشی قابلیتوں کو کام کرنے کا موقع ہی نہ دے، بلکہ ان سے زندگی کا حق ہی سلب کر کے چھوڑے۔

۴۔ اخلاق کی اہمیت | شریعتِ الٰہی کا اساسی اُصول یہ ہے کہ طاقت کے بجائے اخلاق پر انسانی حقوق کی بنیاد قائم ہو۔ حتیٰ کہ ایک طاقتور شخص یا گروہ بھی کمزور شخص یا گروہ کے حقوق ادا کرے جبکہ قانونِ اخلاق اس کی تائید میں ہو۔

مگر قوم پرستی اس کے مقابلہ میں یہ اُصول قائم کرتی ہے کہ طاقت ہی حق ہے اور کمزور کا کوئی حق نہیں۔ اس لیے کہ وہ اسے حاصل کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

۵۔ جائز قوم پروری | شریعتِ الٰہی جس طرح اخلاقی حدود کے اندر نفس پروری کی مخالفت نہیں کرتی اسی طرح وہ قوم پروری کی بھی مخالفت نہیں کرتی ہے۔ درحقیقت وہ اس کی تائید کرتی ہے۔ کیونکہ ایک قوم کے اپنی اپنی جگہ ترقی کرنے ہی پر مجموعی حیثیت سے انسانیت کی ترقی کا دارومدار ہے۔ لیکن شریعتِ الٰہی ایسی قوم پروری چاہتی ہے جو انسانیتِ عامہ (HUMANITY AT LARGE) کی طرف ہمدردی معاونت اور خیر خواہی لیے ہوئے بڑھے اور وہ خدمت انجام دے جو سمندر کے لیے زمین کے دریا انجام دیتے ہیں۔

قوم پرستی اس کے برعکس انسان کے اندر یہ ذہنیت پیدا کرتی ہے کہ وہ اپنی تمام قوتیں اور قابلیتیں صرف اپنی قوم کی بڑائی کے لیے مخصوص کر لے۔ اور انسانیت کا نہ صرف یہ کہ مددگار نہ ہو، بلکہ اپنی قوم کے مقام پر انسانیت کے عمومی مفاد کی قربانی چڑھا دے۔ انفرادی زندگی میں جو حیثیت "خود غرضی" کی ہے، اجتماعی زندگی میں وہ حیثیت قوم پرستی

کی ہے۔ ایک قوم پرست فطرۃً تنگ دل ہوتا ہے۔ وہ دنیا کی ساری خوبیاں صرف اپنی قوم یا اپنی نسل میں ہی دیکھتا ہے۔

۶۔ نبوتِ الہیٰ | قوم پرستی اور شریعت میں کھلا ہوا تصادم ایک اور صورت سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو نبی بھی آئے گا۔ وہ ایک قوم میں اور ایک سرزمین میں آئے گا۔ اسی طرح جو کتاب اس نبی کو دی جائے گی وہ بھی لامحالہ اسی ملک کی زبان میں ہوگی جس میں وہ مبعوث ہوا ہے۔ پھر اس نبوت کے مشن سے تعلق رکھنے والے جن جن مقامات کو عزت و احترام اور تقدیس کی حیثیت حاصل ہوگی وہ بھی زیادہ تر اسی ملک میں واقع ہوں گے۔ مگر ان سب محدودیتوں کے باوجود وہ صداقت اور تعلیم ہدایت جو ایک نبی خدا کی طرف سے لے کر آتا ہے، کسی ملک اور قوم کے لیے محدود نہیں ہوتی، بلکہ تمام انسانوں کے لیے عام ہوتی ہے۔ پوری نوعِ انسانی کو اس نبی پر اور اس کی لائی ہوئی صداقت پر ایمان لانے کا حکم دیا جاتا ہے اور اگر نبی کی دعوت عامہ ہو، عالم گیر ہو، جیسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ہے تو قدرتی بات ہے کہ اس کی لائی ہوئی کتاب کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہوگی۔ اس کی زبان کا تہذیبی اثر بین الاقوامی ہوگا۔ اس کے مقدس مقامات ایک ملک میں ہونے کے باوجود بین الاقوامی مرکزیت حاصل کریں گے۔ وہ نبی اور اس کے حواری اور اس دعوت میں نمایاں حصہ لینے والے ابتدائی لوگ بھی ایک قوم سے تعلق رکھنے کے باوجود تمام قوموں کے ہیرو قرار پائیں گے۔

لیکن یہ سب کچھ قوم پرستوں کے مذاق، افتادِ طبع، جذبات اور نظریات کے خلاف ہے۔ قوم پرست کی غیرتِ قومی اس کو کسی طرح گوارا نہیں کر سکتی کہ وہ ایسے لوگوں کو ہیرو بنائے جو اس کی قوم کے نہیں ہیں۔ ایسے مقام کی مرکزیت اور تقدیس و احترام کو قبول کرے جو اس کے اپنے وطن کے نہیں ہیں۔ ایسی زبان کا تہذیبی اثر قبول کرے جو اس کی اپنی زبان نہیں ہے۔ ان روایات سے رُوحانی فیض (INSPIRATION) حاصل کرے جو باہر سے آئی ہوں۔ وہ ان سب چیزوں کو نہ صرف اجنبی قرار دے گا، بلکہ انہیں اس نفرت اور ناگواری کی نگاہ سے دیکھے گا جس سے بیرونی حملہ آوروں کی ہر چیز دیکھی جاتی ہے۔ اور تمام خارجی اثرات کو اپنی قوم کی زندگی سے نکال دینے کی کوشش کرے گا۔ (مسئلہ قومیت ۱۳۸-۱۴۰)

اسلامی معاشرہ وحی الٰہی کی ہدایات کی روشنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں جو معاشرہ اور ریاست قائم کی تھی وہ نرالا معاشرہ اور نرالی ریاست تھی۔ وہ معاشرہ ہم اقوام تھا۔ (MULTI - NATIONAL) - وہ معاشرہ ہم نسل تھا - (MULTI RECIAL) اور وہ معاشرہ ہم لسان تھا (MULTI LEGUAL) وہاں انسان کی بحیثیت انسان قدر و قیمت تھی۔ رنگ و نسل و وطن کے عوارضات کی چنداں اہمیت نہیں تھی۔ سب باہم شیر و شکر تھے۔ اس معاشرہ میں جو امن و سکون، راحت و آرام اور آزادی حاصل تھی، شرق و غرب کے کسی معاشرہ میں میسر نہ آسکی۔ یہ معاشرہ انسانیت کے لیے نعمت تھا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت تھا۔ اس معاشرہ کی اہم خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ اسلام نے ہر شخص کے لیے عقیدہ اور مذہب کی آزادی کا حق تسلیم کیا۔ قرآن مجید نے واضح اعلان کیا ہے، "تمہارا دین تمہارے لیے اور میرا دین میرے لیے"۔ ایسا کوئی اعلان کسی مذہبی کتاب میں موجود نہیں ہے۔ یورپ میں آزادئ مذہب کا اعلان اس کے ایک ہزار سال بعد ہوا ہے۔ مغربی استعمار کے گھناؤنے پروپیگنڈے کے باوجود یہ بات آج تک ثابت نہیں کی جاسکی کہ اسلام کی اشاعت تلوار کے زور پر ہوئی ہے۔ جب ساری دنیا میں مذہبی اقلیتوں کو ستایا جارہا تھا تو وہ اسلامی ممالک میں امن و چین کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہودی، عیسائی اور ہندو۔ مسلمان مزاج کے اعتبار سے فراخدل ہوتا ہے۔

۲۔ اسلام نے ملت کے نظریہ کے تحت مختلف اقوام کے تہذیبی حقوق کو بھی فراخدلی کے ساتھ تسلیم کیا۔ اسلامی حکومتوں میں اقلیتوں کا مذہب، ان کی زبان اور ان کی ثقافت بھی محفوظ تھی۔ یہودی مذہب کے ربی اور حکماء وہ ہیں جو مسلمان حکومتوں میں گذرے ہیں ہندوستان میں بنگالی ادب اور دوسرے علاقائی ادب کی سرپرستی مسلمان حکمرانوں کی ہے۔ جدید دور کی قوم پرست حکومتوں کا تعلق مذہب سے تو کوئی خاص نہیں ہے، اس لیے مذہبی آزادی کا تو وہ برملا اعلان کرتے ہیں۔ لیکن تہذیبی اور ثقافتی حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ سات سو سال تک جس ملک میں پنڈت اپنے شاستروں کے مطابق ہندوؤں کے فیصلے کرتے رہے اور مسلمان حکمران ان فیصلوں کو نافذ کرتے رہے۔ اس ملک میں مسلمانوں

کو شخصی قانون کا تحفظ بھی حاصل نہیں ہے۔ یہی حال دوسرے ملکوں کا ہے۔

۳۔ بنیادی انسانی حقوق میں اسلام مومن و کافر کے درمیان تمیز نہیں کرتا ہے، جو حقوق مسلمانوں کو حاصل ہیں وہ تمام اقلیتوں کو بھی حاصل ہیں۔ ان کی جان، عزت، آبرو اور مال کی پوری طرح حفاظت کی ذمہ داری مسلمان حکومت پر ہے۔ تاریخ میں بے لاگ انصاف کے واقعات بھرے پڑے ہیں۔ شیر شاہ کا بیٹا ہاتھی پر سوار جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک ہندو عورت معمولی پردے کی اوٹ میں نہا رہی تھی۔ شاہزادے نے اس پر پان کا بیڑا پھینک دیا۔ ہندو نے دربار میں آکر بادشاہ سے شکایت کی۔ شیر شاہ نے فیصلہ کیا کہ شہزادے کی بیوی بھی اسی طرح نہائے، وہاں سے وہ ہندو ہاتھی پہ گذرے اور پان کا بیڑا اس پر پھینکے تاکہ شہزادے کو اس ذہنی اذیت کا اندازہ ہو سکے۔ یہ بے لاگ عدل ہے۔ اس طرح غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت کی جاتی تھی۔

۴۔ معاملات کا فیصلہ بے لاگ، عدل و انصاف کے ساتھ کرنے کا اسلام لوگوں کو حکم دیتا ہے۔ اس معاملہ میں وہ ہر قسم کی جانب داری سے منع کرتا ہے۔

"اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی کے زیادہ قریب ہے۔"

(مائدہ ۔ ۸)

اسلامی ریاست کے اس بیان کو سن کر بعض لوگ یہاں ایک چلتا ہوا جملہ کہہ دیتے ہیں۔ جناب، یہ ایک مختصر سا دور تھا جو گذر گیا۔ اب اس کا ذکر کرنے سے کیا فائدہ۔ میں ایسے تمام لوگوں سے دریافت کرتا ہوں کہ معیاری جمہوری نظام کس ملک میں قائم ہوا؟ کس دور میں قائم ہوا؟ پھر آپ جمہوریت کا کیوں ذکر کرتے ہیں۔ میں ایسے تمام لوگوں سے دریافت کرتا ہوں کہ معیاری اشتراکی نظام کس ملک میں قائم ہوا۔؟ اور کب قائم ہوا؟ پھر آپ اس کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ اہل مغرب ایک مثالی نظام (IDEAL) پیش کرتے ہیں۔ آج تک اس کا معیاری نمونہ صفحۂ ہستی پر قائم نہیں ہو سکا۔ مگر پھر بھی ایک دنیا

اس کی متوالی ہے۔ اسلام بھی ایک مثالی نظام پیش کرتا ہے، جس کا عملی نمونہ اہلِ دنیا نے بچشمِ سر دیکھ لیا ہے۔ اگر ہم اس کی طرف دعوت دیتے ہیں تو آپ فرماتے ہیں کہ اس کی طرف کیوں دعوت دیتے ہو ؎

خرد کو جنوں کہہ دیا، جنوں کو خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

حقیقت یہ ہے کہ جس معاشرہ میں لوگوں کو حقوق حاصل ہوں، عدل و انصاف حاصل ہو، ظلم و زیادتی نہ ہو، وہاں نہ قوم و نسل کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ اکثریت و اقلیت کا، وہاں اقلیتی گروہ کے افراد ـــ مثلاً امام حسن بصریؒ، امام ابوحنیفہؒ، وہ اعزاز و اکرام حاصل کرتے ہیں کہ اکثریت کے بہت سے افراد کی وہاں تک رسائی نہیں۔

فکر و عمل کی جس وحدت کا اسلام داعی ہے اس کا مظاہرہ پانچ وقت کی نماز میں مسجد میں ہوتا ہے۔

؎ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

اس وحدت کا بین الاقوامی عظیم الشان مظاہرہ حج کے موقع پر ہوتا ہے۔ جہاں وحدتِ لباس، احرام ـــ اور وحدتِ لسان، لبیک لاشریک لک لبیک سے سرشار سب ایک مرکزِ توحید کا طواف کرتے ہوتے ہیں۔ جہاں تفریق و امتیازات کے تمام عوامل زائل ہو جاتے ہیں۔ اخوت اسلامی کا فقید المثال مظاہرہ ان شاء اللہ ابد تک جاری رہے گا۔

؎ دنیا کے بُت کدوں میں پہلا وہ گھر ہمارا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

رسائل و مسائل

زیورات پر زکوٰۃ

ملک غلام علی صاحب

سوال: مجھے زکوٰۃ کے بارے میں نصوص شرعیہ کی روشنی میں چند سوالات کا جواب درکار ہے:

۱۔ زیورات کی زکوٰۃ کے بارے میں ایک مکتب فکر یہ پایا جاتا ہے کہ وہ تمام زیورات جو کسی خاتون کے مستقل طور پر زیر استعمال رہتے ہوں، یا وہ زیورات جو فی زمانہ ایک سفید پوش گھرانے کی خاتون کے پاس مستقلاً رہنے چاہئیں، ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ خواہ اُن کے سونے کی مقدار، مقررہ نصاب (یعنی ساڑھے سات تولہ) سے زائد ہی کیوں نہ ہو۔

۲۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ طلائی زیورات تیار کرتے وقت زرگر حضرات اصل سونے کے ساتھ کچھ تانبا وغیرہ بھی شامل کر دیتے ہیں اور پھر خریدار سے اصل سونے اور ملاوٹ کے تانبے دونوں سے مجموعی وزن کو سونے کا وزن قرار دے کر اس کی قیمت وصول کرتے ہیں۔ لیکن جب کوئی شخص اپنا زیور فروخت کرنا چاہے تو زرگر حضرات اُس کے وزن سے، ایک رتی تا سوا رتی فی ماشہ کے حساب سے زیور میں شامل ملاوٹ (یا کھوٹ) کا وزن وضع کر کے زیور کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ زیور کی سال بہ سال زکوٰۃ نکالتے وقت اس میں موجود سونے کی مقدار کا تعین "کھوٹ" نکال کر کیا جائے یا "کھوٹ" شامل کر کے؟

۳۔ ایک ایسی عمر رسیدہ خاتونِ خانہ جس کا نان و نفقہ اب اس کے عزیزوں کی طرف سے فراہم کیا جاتا ہے۔ آیا اس پر اپنے زائد از نصاب زیورات پر زکوٰۃ واجب قرار پاتی ہے؟ جب کہ آپ سے اس زکوٰۃ کی رقم بھی لامحالہ اپنے عزیزوں ہی سے لے کر ادا کرنا ہوگی۔

۴۔ اگر کوئی شخص اپنے ملکیتی زیورات کی زائد از نصاب مقدار کو محض اس خیال کے تحت فروخت کر دیتا ہے کہ اس طرح وہ اپنے اُوپر عائد ہونے والی زکوٰۃ سے بچ جائے گا تو اس کا یہ اقدام، حیلہ جوئی کی قباحت سے ملوث تو نہیں ہو جائے گا؟

۵۔ بعض اوقات سفید سکنی اراضی کے پلاٹ بغرض ذاتی رہائش خرید لیے جاتے ہیں۔ لیکن ایک خیال یہ بھی ہوتا ہے کہ بعد ازاں کسی مناسب موقعہ پر ان کا کچھ حصہ فروخت کر کے (ظاہر ہے نفع پر) تعمیری اخراجات پورے کیے جائیں ایسا پلاٹ اگر ایک سال تک خالی پڑا رہے۔ تو آیا اس کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟ نیز کونسی قیمت پر؟ اس کی قیمت خرید پر؟ یا بوقت حسابِ زکوٰۃ عام بازار کی قیمت پر؟

جواب: آپ کے سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:۔

۱۔ بلاشبہ ایک مکتبِ فکر کے مطابق جو زیورات کسی خاتون کے زیرِ استعمال معمولاً یا مستقلاً رہتے ہوں، اُن پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ لیکن میرے ناقص علم و فہم کی حد تک یہ مسلک قابلِ ترجیح نہیں اور احتیاط اسی میں ہے کہ ہر طرح کا زیور جو بقدر نصاب ہو، اُس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بالعموم استعمال میں رہنے والے زیورات کی تعریف و نوعیت میں عہدِ نبوی و قرونِ ماضیہ کے حالات اور آجکل کے احوال میں بنیادی تغیر واقع ہو چکا ہے۔ اس زمانے میں سونے چاندی کے کنگن، کئی کئی بالیاں، پازیب اور ہار وغیرہ اکثر و بیشتر بیبیوں اور خواتین کا ایسا لباسِ زینت تھیں جو شاذ و نادر ہی جسم سے جدا ہوتا تھا۔ لیکن موجودہ زمانے میں چند ہلکے پھلکے زیورات (مثلاً انگوٹھی، چوڑی، بالی، کانٹے) کے ماسوا زیادہ تر زیور ایسے ہوتے ہیں جو شادی بیاہ

کے موقع پر تو پہنے جاتے ہیں، ورنہ انہیں کمال حفاظت کے ساتھ آہنی سیف یا بنک لاکر میں مُقفل رکھا جاتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بالعموم مستعمل زیورات کی تعریف ہی مشکل ہی سے آتے ہیں اور ان پر زکوٰۃ ادا نہ ہو تو یہ کنزِ ممنوع کی تعریف میں داخل ہو جائیں گے۔

۲۔ جن فقہاء اور محدثین نے زیورات کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ رکھا ہے۔ انھوں نے اس کے ساتھ بعض شرائط بھی عاید کی ہیں۔ مثلاً حنابلہ اور بعض دیگر فقہاء فرماتے ہیں کہ جو زیورات استعمال کے لیے بنائے گئے ہیں اور بوقت ضرورت عاریۃً بھی دیے جاتے ہیں، ان پر زکوٰۃ نہیں۔ انہیں مستعار دینا ہی زکوٰۃ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ احکام وضع کرتے وقت ایسا معاشرہ پیشِ نظر تھا جس کے عام افراد میں سادگی، دیانت داری، بھائی چارگی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اُس وقت زیور ہی نہیں، لباسِ عروسی وغیرہ بھی عاریۃً دیئے اور لیے جاتے تھے۔ آج صورتِ حال قطعاً مختلف ہے۔ سونے چاندی کی قیمت اتنی زیادہ ہو چکی ہے کہ انھیں مستعار دینے میں جتنے خطرات ہو سکتے ہیں، ان سے محفوظ تر اور بہتر راستہ زکوٰۃ دے دینا ہے۔ تاہم اگر کتاب و سنّت میں ایسی نصوصِ قطعیہ وارد ہوتیں جو زیورات کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیتیں تو اُن کی تعمیل و تسلیم میں ہرگز تامّل و تردد نہ ہوتا۔ لیکن یہاں بعض ایسی احادیث موجود ہیں جن میں زیور کی زکوٰۃ نہ دینے پر سخت وعید نبویؐ مذکور ہے۔ مثلاً دو عورتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں جن کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن تھے۔ آنحضورؐ نے پوچھا۔ کیا ان کی زکوٰۃ دیتی ہو۔ انھوں نے نفی میں جواب دیا تو آنحضورؐ نے فرمایا: "کیا تم چاہتی ہو کہ تمھیں اللہ تعالیٰ آگ کے کنگن پہنائے۔ ان کی زکوٰۃ ادا کرو"۔ سنن ترمذی، ابی داؤد، نسائی میں یہ حدیث آئی ہے۔ اگرچہ ان احادیث کی سند میں ضعف ہے، لیکن حنفیہ اور بعض دیگر علماء کا عمل ان کے مطابق ہے۔ چنانچہ امام ترمذی یہ حدیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ اصحابِ علم کا اس مسئلے میں اختلاف ہے۔

صحابہ کرام و تابعین میں سے بعض اہلِ علم کے نزدیک سونے چاندی کے زیور میں زکوٰۃ ہے۔ سفیان ثوریؒ، عبداللہ بن مبارک بھی اسی مسلک کے قائل ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت انسؓ زیور میں زکوٰۃ کے قائل تھیں۔

بہرکیف میرے نزدیک مسلک راجح کے مطابق زیورات بقدر نصاب وزن کے ہوں تو ان

پر زکوٰۃ ہے۔ اس کے حق میں ایک دلیل یہ بھی ہے کہ فقراء اور مساکین کے حق میں یہ زیادہ نفع بخش ہے اور اس پر عمل کرنے والا اختلاف سے بری و بالاتر ہو جاتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے دیار کے متعدد اہل حدیث علماء کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ زیور پر زکوٰۃ عاید ہوتی ہے۔

۳ ـــ زیور کے وزن کا اعتبار کھوٹ کم کر کے بقیہ وزن کے لحاظ سے ہوگا۔

۴ ـــ جو خاتون بقدر نصاب زیور کی مالکہ ہیں، اُن پر زکوٰۃ تو واجب ہے۔ جو عزیز ان کا نان و نفقہ فراہم کرتے ہیں، وہ اُن کی زکوٰۃ بھی دے دیں۔ اس کا اجر و ثواب خاتون اور اعزہ دونوں کو ملے گا۔ یا پھر خاتون زیور کا کچھ حصہ بیچ دیں تاکہ وہ نصاب سے کم ہو جائے۔ ان کے لیے یہ بات ناپسندیدہ حیلہ جوئی میں شمار نہ ہوگی۔ لیکن جو مرد یا عورت اپنی ضروریاتِ زندگی فراہم کر سکتا ہے۔ اور زکوٰۃ بھی دے سکتا ہے وہ آخر زکوٰۃ کو چٹی کیوں سمجھتا ہے؟

۵ ـ خالی پلاٹ پر زکوٰۃ عاید نہیں ہوتی۔ زکوٰۃ (عشر) زرعی پیداوار پر واجب ہے۔

مطبوعات

محفلِ تنہائی از جناب ثاقبہ رحیم الدین - ناشر: (خود) ملنے کا پتہ درج نہیں - ص ۱۴۰ جدید خوشنما طباعت، مجلد مع رنگین گرد اپوش - قیمت: ۴۰/- روپے۔

ادب نام ہی شائستگی، سنجیدگی اور توازن کا ہے ــــ رویّے میں بھی، اور تحریر میں بھی۔ جناب ثاقبہ رحیم الدین کے قلم نے نہ صرف اس بنیادی قلمرو پر اپنا سکہ جاری کر دیا، بلکہ شوخیٔ تحریر کے جزیرۂ شاداب میں بھی اپنا لوہا منوا لیا۔ لوہے کا ذکر ان کی ادیبانہ بلوریں شخصیت کے ساتھ شاید سجتا نہیں۔ مگر محاورے کی مجبوری!

تنقید، تبصرہ اور ابتدائیہ پر مشتمل بابِ اوّل کو پڑھیے تو کچھ کہنے کو باقی ہی نہیں رہتا، بلکہ ساری توجہ سمجھنے اور استفادہ کرنے پر مرتکز ہو جاتی ہے۔

"کچھ کلامِ اقبال کے بارے میں" ـــ اس حصے میں علامہ پر تین مضامین ہیں اور حیران ہوں کہ اقبال پر اتنی کثرت سے نگارشات لکھی اور چھاپی جا رہی ہیں کہ ان کے درمیان جناب ثاقبہ نے اپنی کہنے کی باتیں اور اپنا اسلوب سب سے الگ نکال لیا۔

پھر طنز و مزاح کی طرف متوجہ ہوئیں تو جدید ثقافت کی ایک دلچسپ جھلک دکھائی۔ شوخیٔ قلم بھی اسی قصے کا ایک لازمی عملی حصہ ہے۔ یہاں ثاقبہ صاحبہ نے شوخیٔ تحریر کا رنگ دکھایا ہے، مگر کیا مجال کہ ثقاہت کے آئینے میں کوئی بال آ جائے۔

آخر میں مضامین و مقالات کے دائرے میں ۵ تحریریں ہیں۔ ادب اور آرٹ کا اسلامی نمونہ بڑا جامع مقالہ ہے جو نہ صرف مصنفہ کی وسعتِ مطالعہ کا گواہ ہے، بلکہ اس میں اپنے سرمایۂ ادب و فنون کے لیے ایک جذبہ کارفرما ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام اور

کردار کی ایسی خوبصورت تصویر کھینچی ہے جس کا ایک ایک لفظ اُن کے جذبہ ہائے محبت و ایمان کا گواہ ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایسی پختہ ایمان خواتین موجود ہیں جو ارشاداتِ رسالتمآبؐ کو دَورِ جدید کے تحت تحریف کا شکار بنانے کا تصور نہیں رکھتیں۔

اور اسی دائرے میں ہے: موجودہ "ادبی تخلیقات میں جمالیاتی عنصر کا فقدان"، پھر "کہانی کی کہانی" اور "سمندر" جیسے انشائیے ہیں۔

لفظوں کے انتخاب، عبارت کی ترتیب، بیان کے اسالیب بہت دامن کشِ توجہ، مگر ان صفحات کا دامن تنگ ہے۔

ہم اس کتاب کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

MEMOIRS OF CHILDHOOD & YOUTH — از مکرمہ مریم جمیلہ، مفکر و دانشور خاتون (نومسلمہ) ناشر: محمد یوسف خاں اینڈ سنز، "اصلی انگریزی اور خوب صورت ٹائپ۔ صفحات: سوا دو سو۔ قیمت درج نہیں۔ ۴۹/۱۵ سنت نگر، لاہور۔

یہ ایک داستان سفرِ ہجرت ہے۔ مغربی لادینیت اور یہودی طلسم ساحرانہ سے اسلام کی طرف۔ داستان کا یہ اہم پہلا باب ہے جو اتنی تفصیل سے سامنے نہ تھا۔ علامہ اسد جس "روڈ ٹو مکہ" پر چلے تھے، اس کے مقابلے میں مریم جمیلہ کو خاردار پگڈنڈیوں سے ہو کر لمبا سفر کرنا پڑا ہے اور بڑے مشکل غریبانہ حالات ہیں۔ وہ جب نوخیز طالبہ تھیں تو انھوں نے اتنا کچھ پڑھ ڈالا اور ان میں اتنا کچھ اخلاقی ذوق نشوونما پا گیا کہ انھیں مغرب کی بہترین مجالس اور اداروں اور خود یہودی سوسائٹیوں میں جن احوال و مناظر سے سابقہ پڑتا، ان سے وہ بہت جلد بے قرار ہو جاتیں۔ اس طرح معاشرے نے اُنھیں تنہائی کی طرف دھکیلنا شروع کیا۔

ایک مرتبہ مریم جمیلہ نے اپنے والدین کے سامنے اسلام کے حق میں کچھ کلمات کہے تو والد نے غصے سے کہا کہ تم ہمیں اسلام کے ذریعے قرونِ وسطیٰ میں واپس لے جانا چاہتی ہو۔ ہم ایسی باتیں سُننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ایک بار والد نے ذکر کیا کہ ۲۰۰ ڈالر بطور چندہ اسرائیل بھجوا

رہا ہوں۔ مریم جمیلہ نے کہا کہ نتیجہ یہ ہوگا کہ چندا ور ہتھیار لیے جائیں گے اور چند اور عرب بچے خون میں نہا جائیں گے۔ تب برہم ہو کر والد نے کہا کہ اس کمرے سے فوراً نکل جاؤ۔ وہ جلدی سے اپنے کمرے پہنچی اور دروازہ بند کر کے پڑی روتی رہی۔ ایک بار تو انہوں نے کہا کہ ہم اب تمہیں برداشت نہیں کر سکتے۔ جاؤ اور جا کر اپنے لیے رہنے کی کوئی الگ جگہ تلاش کرو۔ آئندہ ہمارے سامنے نہ آنا۔ ایک بار کہا کہ تم تو معروف دشمنانِ یہود سے بڑھ کر ہماری دشمن ہو۔

مریم جمیلہ ہوسٹل میں رہی، اُسے ڈاکٹروں سے مل کر فاؤنٹن ہاؤس میں جبراً داخل کرا دیا گیا۔ پہلا موقع ملتے ہی وہ واشنگٹن کے اسلامک سنٹر میں پہنچی۔ رفتہ رفتہ کئی شخصیتوں سے ملی، اور محض اپنے مطالعہ کے بل پر اس نے پہچان لیا کہ کون غلط ہے اور کون صحیح۔ پھر اس نے عالم اسلام کے اکابر سے خط و کتابت شروع کی۔ اسی سلسلے میں رابطہ مولانا مودودیؒ سے ہوا تو انہوں نے پاکستان میں آنے کی دعوت دی۔ بس سارا مسئلہ حل ہو گیا۔ آج وہ دو بیویوں والے شوہر کی بیگم ثانی ہیں۔ اپنی خوشی سے انہوں نے اس کا فیصلہ کیا۔ نہایت خوش و خرم رہ کر وقت گزارا۔ ایک بیگم سارے بچوں کو سنبھالتی رہی اور ایک بیگم نے ٹائپ لے کر کئی کئی عالمانہ کتابیں تحریک اسلامی کی خدمت کرتے ہوئے لکھ دیں۔

یہ "میمائرز" پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں کہ ایک لڑکی مظلومی کے حالات بیچ ایک مقصد کے لیے اس طرح گذرتی ہے جیسے ناول کا کوئی کردار سامنے متحرک ہو۔

ہائے! سچا اسلام کتنا مشکل ہے؟ اس کے چشمۂ حیات تک رسائی کے لیے جنہوں نے جانفشانیاں کیں وہی اس کی قدر جانتے ہیں۔ ہمیں تو خداوند کریم نے بیٹھے بٹھائے اس طرح ایمان عطا کر دیا کہ جیسے بچے انکل سے ٹافی لے کر چوس لیں۔

مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ مریم جمیلہ جیسی علمی شخصیت سے جو مغربی زندگی کی تاریکیاں کو جگمگاتی روشنیوں کے نیچے سے تلاش کر لیتی ہے، کوئی اعلیٰ درجے کا کام نہ لیا جا سکا۔ مثلاً یونیورسٹی یا کالجوں میں اس کے بصیرت افروز لیکچر ہوتے۔ وہ خواتین کے سیمیناروں کی صدارت کرتی۔ مگر شاید وہ خود ہی گھرداری اور تنہائی کو بہت پسند کرتی ہے۔ اور اس پردہ پسند خاتون

تک خواتین کی نگاہیں پہنچتی ہی نہیں ۔ اس کی کتابوں کے اردو تراجم ہوتے، ان کی تعارفی تقاریب ہوتیں ۔ مگر ۔۔۔ !!

اسلامی صحافت | از جناب سید عبدالسلام زینی (مرحوم) ۔ ناشر: ادارہ معارفِ اسلامی ، منصورہ ، لاہور ۔ تقسیم کنندہ المنار بک سنٹر، منصورہ ، ملتان روڈ ، لاہور ۔ صفحات ۳۲۰ طباعت اچھی ۔ ٹائیٹل دلکش ۔ قیمت : ۴۵/- روپے ۔

سید عبدالسلام زینی نے اپنا جو مختصر سا سرمایۂ خطوط و نگارشات چھوڑا ہے ، اس میں " اسلامی صحافت " ایک قیمتی ورثے کی حیثیت رکھتی ہے ۔ میں مختصراً کہوں گا کہ میں اس کتاب کو پڑھ کر بہت متاثر ہوا ۔ ایک تو اس کے مطالعہ سے یہ ایمان اور زیادہ محکم ہو جاتا ہے کہ اسلام نے زندگی کے کسی بھی معاملے کو نظر انداز نہیں کیا ۔ بلکہ پوری رہنمائی فراہم کر دی ہے ۔ اب علوم و فنون کی مختلف موضوعات کے تحت ترتیب پیروانِ اسلام کا اپنا کام ہے ۔ دوسری یہ بات کہ زینی مرحوم نے ایسی وسعت سے بحث کو چھیڑا ہے اور اتنے تفصیلی عنوانات قائم کئے ہیں کہ اسلامی صحافت کے علم کو سائنس بنا دیا ہے ۔

کچھ عرصے سے ہماری اعلیٰ تعلیم گاہوں میں یہ مضمون بڑی اہمیت سے پڑھا جا رہا ہے اور اس سے آراستہ نوجوانوں کے لیے بڑا وسیع میدانِ کار بھی موجود ہے ۔ لیکن بدقسمتی سے آج تک نصابی مواد صرف وہ تھا جو مغربی مفکرین اور نصابی مصنفین نے فراہم کیا تھا ۔ وہ تو اپنی جڑ بنیاد ہی سے غلط ہے ۔

آج کل " خبر " کو موڑنے ، اس سے مغالطے پیدا کرنے اور محبت و نفرت یا حمایت و مخالفت کے جذبات اُبھارنے کا کام جس طرح لیا جاتا ہے اُسے پروپیگنڈا کہتے ہیں ۔ اور پروپیگنڈا مشینری (نیز متعلقہ ذرائع) سامراجی قوتوں کے زیرِ نگیں ہیں ۔۔۔۔ لہٰذا ہماری ہی کسی خبر کو پروپیگنڈے کے خراد پر چڑھا کر ایسا آئینہ بنا دیتے ہیں کہ اس آئینے میں ہمیں اپنی صورتیں بدنما اور دشمنوں کی اچھی معلوم ہوتی ہیں ۔ پھر ہم کوئی جواب دینا چاہیں تو پروپیگنڈے کے وسیع نظامِ شمسی میں (جو بہ اہتمامِ دشمن ہے) ایسا لگتا ہے کہ کسی ٹوٹے ہوئے کرتے کا

کوئی سیر بھر تاریک ٹکڑا اچھلا آ رہا ہے جسے نہ کوئی دیکھتا ہے، نہ پہچانتا ہے۔ ہماری کسی بات کو چاہیں تو اغیار ہی اچھالیں اور کوئی سی شکل دے کر اچھالیں۔ پھر ہم اپنی خبر انہی سے لے کر اپنے ہاں اسے اچھائی اور سچائی کا معیار بنا لیتے ہیں۔

پروپیگنڈا کے اس طلسماتی مقتی ایٹر کے خلاف زینی صاحب نے اس ضرورت پر شدید زور دیا ہے کہ مسلمانانِ عالم کو اپنی طاقت ور اور مؤثر مشینری وضع کرنی چاہیے (ویسے ذرا ARABIA کا حشر بھی سامنے رہے) اور اس کے لیے اسلام کے واضح کردہ اُصولِ صحافت، کلمۂ حق، آوازۂ ضمیر اور شہادتِ حق کے اُصول اور پھر خبر رسانی و خبر بیانی کے متعلق پورا نظامِ اخلاق انہوں نے بیان کر دیا ہے۔

تمام صحافی، طلبائے صحافت، سیاسی لوگ، عام ذی شعور نوجوان سبھی اس کتاب کو پڑھیں جس کی بعض عبارات تو ادبی لحاظ سے بھی شاہکار ہیں۔

مُسلم نَشاۃِ ثانیہ؟ | جناب ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی ۔ ناشر: مطبوعاتِ جاوید، بی ۶۳۱، بلاک ۱۳۔ فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ اچھی طباعت، سفید کاغذ پر، ضخامت ۸۵ اصفحات، اچھی سفید سادہ جلد۔ قیمت: -/۴۲ روپے۔

آسمانِ قلم و اشاعت پر ایک دلکش کتاب کا ستارہ چمکا ہے۔ مصنف کی خدمت میں مبارک باد!

میرا اس کتاب کو پڑھتے ہوئے یہ جی چاہتا تھا کہ اس کے صفحے اور پیرے تبصرے میں لکھ دوں گا۔ مگر اتنی مجال کہاں! اب مختصراً یہ کہتا ہوں کہ ہماری چودہ سو سالہ داستان ہے رفعت و سرفگندگی کی ــــ "ایسی بلندی، ایسی پستی"! مگر یہ بانداز نوحہ و مرثیہ نہیں، نہ بہ طرزِ اظہارِ کبر و تفاخر۔ یہ کتاب تو حوصلوں کو بلند کرنے والی، طلسمِ ہیچ مندا ری سے نکالنے والی، ہماری تہذیب کا اصل چہرۂ درخشاں دکھانے والی اور ہمارے ہاں سائنسی ترقیوں کے پھریرے اڑانے کے دورِ رفتہ کو سامنے رکھ کر یہ یقین دلانے والی ہے کہ یہ تمھی تو تھے جنہوں

نے تخت و تاج ہی سے کام نہیں رکھا، بلکہ قلم کٹھالی اور نگاہ مشاہدہ اور شوق تجربہ سے زمین سے آسمان تک ہنگامہ مچائے رکھا۔ اب تم کیوں محض دوسروں کے مرعوب گداگر بن کر رہ گئے۔ توڑو اس طلسمِ غیر پرستی کو اور چھوڑو غفلت کی ہیروئن کے نشے میں آرام سے پڑے رہنے کو ـــــ اٹھو اور زمین کا سینہ چیرو اور آسمانوں پر کمندیں ڈالو، ہواؤں اور شعاعوں کو مسخر کرو، لوہے اور پیتل اور پلاسٹک کو مجبور کرو کہ وہ تمہارے لیے اور دوسرے انسانوں کے لیے خدمات انجام دیں۔

انداز بیان دلچسپ، تمام مباحث حوالوں سے آراستہ، ہر باب کے آخر میں نوٹس، کتاب کے خاتمے پر اشاریہ!

سیکولر معاشرے میں مسلمانوں کی تعلیمی حکمتِ عملی جناب خرم جاہ مراد۔ ناشر: ادارۂ تعلیمی تحقیق۔ تنظیم اساتذہ پاکستان - ۸ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور۔ قیمت: ۸/- روپے

۴۲ صفحے کے اس اہم پمفلٹ میں بہت بڑے مسئلے کو چھیڑ کر اس پر عمل کرنے کا مواد دیا گیا ہے۔ چند الفاظ اور جملوں سے شاید آپ پورے مبحث کا تصور کر سکیں ـــــ "ہم اسلامی تعلیم اور اسلام کے بارے میں تعلیم، میں امتیاز کریں" (ص ۷) "ہمیں ایک ایسی طاقتور تہذیب درکار ہے جو غالب تہذیب کے خلاف پیش قدمی کرنے کی اہل ہو"۔ "ایک معاشرے کے اندر دوسرا معاشرہ قائم کرنے اور ایک تہذیب کے اندر دوسری تہذیب برپا کرنے کے لیے معاشرے کو تبدیل کرنے کا عزم ناگزیر ہے" (ص ۱۰ - ۱۱)۔ "ہمیں صرف لینا نہیں، ہمارے پاس دینے کے لیے بہت کچھ ہے" (ص - ۱۱)۔ "گھر"، "ہم جولی" اور "پڑوس" کی تعلیمی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ (ص - ۱۸) ـ "ہمیں ایک ایسی تحریک شروع کرنے کی منصوبہ بندی کرنا چاہیے جو ہر گھر کو ایک مسلم سکول بنا دے" (ص ۱۹) "ایک متبادل زندگی کا ماحول برپا کرنے کا تخیل (ص ۲۰)

تعلیمی حکمتِ عملی پر کام کرنے کے اصول بڑی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔
اِس کتاب کے بین السطور میں مولانا مودودی کی رُوحِ فکر جھلکتی محسوس ہوتی ہے۔

مشرقی پاکستان کی یادیں از جناب سید اسعد گیلانی ۔ ترتیب و تدوین : اسلامی اکادمی منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۔ ناشر: حماد بلی کیشنز، اردو بازار، لاہور صفحات ۱۶۰ قیمت: -/۲۷ روپے ۔

برادرم گیلانی صاحب اور ہیں عمر کے ایسے حصے ہیں، جب کہ ہر فارغ وقت میں یادوں کے فلم دماغوں کے ہال میں چلتے رہتے ہیں ۔ آدمی چاہتا ہے کہ یہ تماشا دوسروں کو بھی دکھائے ۔ مگر اسعد صاحب کی یادیں تو تاریخ بھی ہیں، درسِ دعوت بھی، تحریکی کارکنوں کے لیے سامان تربیت بھی ۔ اور پھر وہ حلد درجہ" حسین و دلنواز" بھی ہیں (ص ۶)

اس البم میں تین قسم کی تصویریں ہیں ـــــ عام بنگالی مسلمانوں کی تصویر ہے ۔ مسلم لیگ کی تصویر ہے اور گیلانی صاحب کے رفقائے تحریک کی تصویر ہے (ص ۷ ـ ۸) ۔

مولانا مودودیؒ کے فیصلے کے تحت چوہدری علی احمد خاں مرحوم کے معاون کی حیثیت سے گیلانی صاحب ۱۰ رجون ۱۹۵۴ء کو کراچی سے روانہ ہوئے ۔ پھر وہاں جا کر ان حضرات نے جس سرگرمی سے کام کیا اُس کا تصور آپ اس مختصر کتاب سے اخذ کر سکتے ہیں ۔ گیلانی صاحب وہاں کے سرسبز و دلکش ماحول، وہاں کے دریا، وہاں کی کشتیاں، وہاں کے اناناس اور ناریل، وہاں کی مچھلیاں، وہاں کی چٹائیاں اور ٹوکریاں، وہاں کی غربت، وہاں کی غذائیات اور خصوصیات کو جزبہ جز آپ کے سامنے دلکش انداز میں رکھتے ہوئے ساتھ ساتھ اپنی خدمات اور وہاں کے رفیقوں کی محبتوں اور جان کاہیوں کی داستان بڑی دلچسپی سے سناتے ہیں ۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد جیسے پھر کچھ رہ ہی نہیں جاتا ۔ مگر افسوس کہ ہماری بہترین مہمات کے کئی برس کی محنتیں اس حادثے کو نہ روک سکیں جس نے پاکستان کو دولخت کر دیا ۔

تفکّر مدیر مسئول سید شبیر بخاری ۔ مقام اشاعت : ۵۲۳ جہاں زیب بلاک، مخدوم جہانیاں اکیڈمی، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور ۔ کوڈ: ۵۴۵۷۰ ۔ فی شمارہ -/۱۵ روپے ، زرِ سالانہ پچاس روپے ۔

یہ جلد اوّل کا شمارہ دوم ہے ۔ مجلہ ہذا سہ ماہی بھی ہے اور سہ لسانی بھی (یعنی اُردو

فارسی (+ عربی) اور انگریزی) - مندرجات کا یہ نقشہ کہ مختلف علمی موضوعات کے تحت چھوٹے چھوٹے دلچسپ مضامین - طبعزادبھی اور ترجمہ شدہ بھی۔

علامہ شبیر بخاری صاحب کی علالتی پہ ہم دیرینہ ایمان رکھنے والے ہیں اور بخاری صاحب ایک ایسے استاد رہے کہ جن کے شاگردوں کا نہ صرف حلقہ وسیع ہے بلکہ ہر شاگرد کے دل میں ان کا روشن کردہ چراغ ضرور محفوظ ہے - اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ علامہ بخاری صاحب پورے پاکستان میں پھیلے اور بکھرے ہوئے زندگی بسر کر رہے ہیں - کتابی معلومات کے علاوہ وہ جب اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات بھی کسی بحث میں شامل کرتے ہیں تو گویا کھانے کے ساتھ "ساس" اور "سلاد" کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

پھر قصے ایسے ایسے نکالتے ہیں کہ آدمی حیرت کے دریا میں ڈوب جاتے سے بمشکل ہی بچتا ہے - مثلاً سلّی پرودھام (فرانس) کے نوبل پرائز کا قصہ - ہم نے اسے بہت پہلے میں پڑھا تھا مگر اب تو سب کچھ بھول گیا - یا "جنگِ عالمگیر کی کہانی چرچل کی زبانی" پھر "اعلانِ تاشقند" بھی، "آلودگیٔ آب بھی، زرعی معیشت بھی، مسئلہ ارتداد بھی، پھر شروع میں" مسئلۂ زن" بھی، جسے جتنا سلجھایا گیا اتنا ہی اُلجھ گیا۔

تفکر فی القرآن، تفکر فی الحدیث، افکارِ صحابہ، فکرِ افغانی، صحیح معرفت اور مثنوی مولانا رُوم کا ترجمہ کئی اور مندرجات بھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بخاری صاحب جہالت افروز تعلیم کے مارے ہوئے نوجوانوں میں ایمان و علمِ حق کی یخنی نکال کر جلد سے جلد آباد دینا چاہتے ہیں - خدا کرے ان باتوں میں کوئی خلافِ ادب نہ ہو، اپنے محب و مشفق چند ہی بزرگ تو رہ گئے ہیں۔

مجھے اور بھی کتب و جرائد پر لکھنا تھا، مگر اِن دِنوں کشتیٔ
صحت ایسے گردابوں سے گذر رہی ہے کہ میں لکھنے کا زیادہ
کام بھی نہیں کر سکتا، لہٰذا متعلقہ احباب سے معذرت — !

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

ستمبر ۱۹۸۹ء

ترجمۂ قرآن مجید

مع مختصر حواشی

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ